نئی تنقیدی معنویت

(تحقیقی وتنقیدی مضامین)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

نئ تنقیدی معنویت

(تحقیقی و تنقیدی مضامین)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں و کشمیر)

Nayi Tanqeedi Manwiat

BY

Dr Mushtaq Ahmed Wani
Assistant professor department of urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University Rajouri (J&K)
Lane No 3, House No 7 Firdousabad Sunjwan Jammu 180011
E-mail:drmushtaqahmedwani@gmail.com
Mob.9419336120,7889952532

Year of Edation: 2020, Price: 300/-

نام کتاب : نئی تنقیدی معنویت (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
مصنف : ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سن اشاعت : 2020ء
قیمت : 300روپے
مطبع :
کمپوزنگ : افضل حسین بستوی دہلی،9868594259

—: ملنے کے پتے :—

انتساب

باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کی مخلص اور کرم فرما شخصیات کے نام

1۔ محترم پروفیسر جاوید مسرت صاحب (وائس چانسلر)

2۔ محترم ڈاکٹر اشفاق احمد زری صاحب (رجسٹرار)

3۔ محترم پروفیسر اقبال پرویز صاحب (ڈین آف اکیڈمک افیرس)

4۔ محترم محمد اسحٰق صاحب (کنٹرولر)

5۔ محترم پروفیسر جی ایم ملک صاحب (ڈین آف اسٹوڈینٹس ویلفیر)

6۔ محترم ڈاکٹر نسیم احمد صاحب (ڈین آف سوشل سائنس)

7۔ محترم وشوامترشرما صاحب (ڈپٹی رجسٹرار فائنانس)

8۔ محترم ڈاکٹر شمس کمال انجم صاحب

(صدر شعبۂ عربی، اُردو، اسلامک اسٹڈیز اور چیف وارڈن)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

فہرستِ مضامین

....

ڈاکٹر شریف احمد قریشی
سابق صدر، شعبۂ اُردو
گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج، رام پور (یو پی)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا مجموعۂ مضامین ''نئی تنقیدی معنویت''

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نہ صرف جموں وکشمیر بلکہ پوری ادبی دنیا کے ایک معتبر اور معروف قلم کار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ درس وتدریس اور اُردو زبان وادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اُن کی متعدّد ادبی، علمی، تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی نگارشات منظر عام پر آچکی ہیں۔ افسانوی تخلیقات کے علاوہ اُن کے بہت سے تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین ومقالات موقر اخبارات ورسائل کی زینت بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ بڑی سرعت اور نہایت آب وتاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اُنہیں اس عہد کے اُن قلم کاروں میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے جن کے قلم کی روانی اور قوّت فکر میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی تازہ ترین تصنیف کا نام ''نئی تنقیدی معنویت'' ہے جس میں مختلف موضوعات ونوعیت کے تیرہ وقیع مضامین کی شمولیت ہے۔ ان مضامین میں سے سات مضامین شعراء وادباء کی شخصیت اور فکر وفن سے متعلّق ہیں جن کے عنوانات مشتاق احمد یوسفی: شہنشاہِ ظرافت کی ابدی خاموشی، شریف احمد قریشی: بحیثیت محقق وشاعر، اصغؔر ویلوری کی شعری استعداد، شاہبازؔ راجوروی کا 'اعراف' گناہ وثواب کا اعتراف، تنویؔر بھدرواہی: شخصیت اور شاعری، انجم عثمانی کی کہانی 'وہ ایک بوڑھا' کا تجزیہ اور ڈاکٹر وقار الحسن صدّیقی: حیات اور کارنامے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے مذکورہ مضامین کے ذریعہ درج بالا ادباء وشعراء کے فکر

وفن پر روشنی ڈالنے کے ساتھ انہیں داد و تحسین سے بھی نوازا ہے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے ان کے فن پاروں کا جائزہ بھی لیا ہے۔ متذکرہ مضامین کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اُردو کے شعری ونثری ادب کے رمز شناس ہیں۔ فن وشخصیت پر تحریر کردہ اُن کے بیشتر مضامین نہایت دل چسپ، تجزیاتی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں جن کے ذریعہ فنکاروں کی شخصیت کے اہم گوشوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ان کے اسلوب وفن کی خصوصیات کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض فنکاروں کے کردار اور ادبی وعلمی پہلوؤں کو معلوماتی اور مثالی انداز میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ بطورِ مثال پیش نظر ہیں چند مضامین سے اخذ کیے گئے مختصر اقتباسات یا جملے۔ ملاحظہ فرمایئے:

— مزاح کے جتنے بھی حربے ہیں سب مشتاق احمد یوسفی نے بحسن وخوبی استعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسالیبِ ظرافت میں مزاحیہ ماجرا نگاری، کردار نگاری، لفظی مزاح، تحریف نگاری یعنی پیروڈی، موازنہ اور علمی بیان کے علاوہ قول محال کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔

(مضمون: مشتاق احمد یوسفی: شہنشاہِ ظرافت کی ابدی خاموشی)

— ڈاکٹر شریف احمد قریشی کے ان تمام اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نرم مزاج، وسیع فکر ونظر اور حیات وکائنات میں انسان کی عظمت ورفعت کے قائل ہیں اور انسانی اقدار کے فقدان پر ملول ومضطرب بھی۔ ناصحانہ جذبات واحساسات سے مملو ان اشعار سے شاعر کی انسان دوستی، خلوص، محبت واخوت کا درس تو ملتا ہی ہے لیکن دوسری طرف فرد اور سماج کی عیّاری اور مکّاری کا ایک دل سوز رُخ بھی عیاں ہونے لگتا ہے جو ایک حسّاس، صاحبِ فہم وفراست شخص کے لئے مایوسی کے کئی باب کھول دیتا ہے۔

(مضمون: شریف احمد قریشی: بحیثیت محقق وشاعر)

— اصغؔر ویلوری کے پاس مومنانہ وضع قطع اور سوچ کے ساتھ آدمی کو انسانی صفات سے متصف دیکھنے کی للک موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری کا بیشتر

حصّہ معرفتِ الٰہیہ ،عقیدت وعظمتِ محمدیہ کے علاوہ متصوفانہ جذبات واحساسات کاغمّاز ہے۔(مضمون:اصغؔر ویلوری کی شعری استعداد)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اپنے مزاج وکردار کی طرح اپنی نگارشات ومضامین میں بھی درمیانہ روی اختیار کی ہے۔اُن کے یہاں نہ تو بے جا طوالت ہےاور نہ اختصارِ بے جا۔وہ زیرِ تنقید یا زیرِ تجزیہ فن پارہ کی مثبت خصوصیات واوصاف کونہایت سلیقے سے نمایاں کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔وہ کسی تخلیق میں بے وجہ خامیاں نکالنے کومستحسن نہیں سمجھتے۔ ہاں اگر کہیں ضروری ہواتو معائب اور کمزور پہلوؤں کی طرف نہایت شائستگی سے توجہ بھی مبذول کرادیتے ہیں۔

اس مجموعہ کے ایک اہم مضمون کا عنوان 'اُردو میں تانیثی تنقید' ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے تانیثی ادب کا نہایت گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اُن کے ایک اہم اور گراں قدر تحقیقی مقالہ کا عنوان ''اُردو ادب میں تانیثیت'' ہے۔اس مقالہ پر ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی ، بریلی نے انہیں ۲۰۱۲ء میں ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا تھا۔اس مضمون میں مصنف نے تانیثیت کی اصطلاح اوراس کے تاریخی وسماجی پس منظر کے ساتھ اردو میں تانیثی تنقید پرنہایت سلیقے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔وہ تانیثیت کے معنی و مفہوم کواس طرح واضح کرنے کی سعی کرتے ہیں:

> ''جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تواس سے ہماری مراد نہ صرف عورتوں کے جذبات واحساسات،مشاہدات وتجربات اوررجحانات سے ہے بلکہ اُن خواتین رہنماؤں کی صدائے احتجاج سے ہے جنہوں نے مردوں کی بالادستی،اُن کے ڈھائے ہوئے عورتوں پرظلم وستم اور جبر واستبداد کے علاوہ اپنی محکومیت کے خلاف آواز بلند کی، جس میں عورتوں کے حقوق،بچّوں کی پرورش کے حقوق،جائیداد میں معقول حصّہ،طلاق کے مسائل کی وضاحت،مختلف تعلیمی شعبوں میں عورتوں کے حقوق اور اُن کی شمولیت،مردوں کے برابر اجرت کا

تقاضا اور ووٹ کا حق جیسے مطالبات شامل تھے۔"

اس مجموعہ میں شامل جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق، اکیسویں صدی میں اُردو کے مسائل، فیس بُک آئی کتاب گئی (تماشوں میں مست و مگن آدمی ہے) اور چراغِ دل کا جلاؤ بہت اندھیرا ہے بھی بے شبہ اہمیت کے حامل اور فکر انگیز مضامین ہیں۔ متذکرہ مضامین کے مطالعہ سے مصنف کی وسیع معلومات، روادارانہ روش اور متوازن تنقیدی و تجزیاتی رجحان اور مزاج و ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس طرح خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے مقدّمہ شعر و شاعری میں شاعر کو جھوٹ اور مبالغہ سے احتراز کرنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شعر میں جہاں تک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سر رشتہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہئے" اسی طرح ڈاکٹر مشتاق احمد وانی تحقیق کو سچ کا کاروبار تصور کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "علم و ادب کی دنیا میں تحقیق کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں تحقیق کو سچ کا کاروبار سمجھتا ہوں۔" (مضمون: ڈاکٹر وقار الحسن صدّیقی: حیات اور کارنامے)

دراصل تحقیق کا اصل مقصد حقائق کی بازیافت اور حقیقت تک پہنچنا ہی ہے۔

مقدّر کیا ہے اور کیا نہیں ہے، کے عنوان سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی مقدّر کے متعلّق اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

> "اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ آدمی کے بُرے افعال کا تعلّق مقدّر کے ساتھ جوڑنا سراسر حماقت ہے۔ بُرے اعمال، بُری باتیں، بُرے طور طریقے بُری نیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دراصل قسمت، مقدّر اور تقدیر کا تعلّق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دنیا کے بُرے لوگ اپنی تمام بداعمالیوں کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے موبائل فون، انٹرنیٹ اور فیس بُک کے منفی اثرات کو دو ٹوک الفاظ میں اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

''کتابیں انسان کی بہترین ساتھی ہوا کرتی تھیں۔ کتابوں سے دوستی ایک ایمان دارانہ اور عالمانہ عمل مانا جاتا تھا۔ سنجیدہ، باذوق اور باادب قسم کے لوگ کتاب کی عظمت، اہمیت وافادیت کو بہتر جانتے تھے لیکن موبائل فون نے ہم کو مکتوب نگاری سے دور کر دیا اور انٹرنیٹ نے ہم سے کتاب چھینی، فیس بُک دے دی۔ کتابیں اب بھی لکھی جا رہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی لیکن اُنہیں پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔'' (مضمون: فیس بُک آئی کتاب گئی: تماشوں میں مست و مگن آدمی ہے)

بہترین شخصیت کی تعمیر میں سنسکار یعنی صالح اعمال و تربیت کا رول نہایت اہم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے نزدیک بھی شخصیت کی بہترین تعمیر کے لیے والدین کے ذریعہ تربیت، مرشد کامل کی صحبت اور اچھے ماحول کا ہونا لازمی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''کسی بھی شخص کی پُروقار شخصیت سازی میں تین عناصر کا خصوصی عمل دخل ہوتا ہے۔ والدین کی بہترین تربیت، مرشدِ کامل کی صحبت اور اچھا ماحول'' (مضمون: تنویر بھدرواہی: شخصیت اور شاعری)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے بیشتر مضامین مفید ترین مطالب اور کارآمد نکات پر مبنی ہیں۔ وہ اپنی افسانوی تخلیقات ہی کی طرح اپنے مضامین قلم بند کرتے وقت موقع و محل کی مناسبت سے فکر انگیز، توجہ طلب اور چونکانے والے نکات و جملے اس طرح نذرِ صفحۂ قرطاس کر دیتے ہیں کہ قارئینِ مشتاق غور و فکر کے لیے مجبور سے ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

— کسی بھی طرح کا ذوق و شوق انسان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ اپنے شوق کی تکمیل چاہتا ہے جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ محنت، لگن اور کوششِ پیہم ایسا جذبہ ہے جو انسان کو کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے۔

(مضمون: تنویر بھدرواہی: شخصیت اور شاعری)

— ایک اچھا شاعر و ادیب اس جہان فانی سے گزرنے کے بعد بھی اپنی موجودگی کا

احساس دلاتا رہتا ہے۔(مضمون:تنویر بھدرواہی: شخصیت اور شاعری)

— لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے جب کوئی آدمی خاصا مشاق اور تجربہ کار ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہ عام قاری رہتا ہے اور نہ عام لکھاری۔

(مضمون: شاہباز راجوروی کا 'اعراف' گناہ وثواب کا اعتراف)

— کوئی بھی ادب پارہ صحیفہ نہیں ہوتا۔ انسان بشر ہے اور بشریت اس کی سرشت میں ہے اس لیے معائب ومحاسن کا پایا جانا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔

(مضمون: شاہباز راجوروی کا 'اعراف' گناہ وثواب کا اعتراف)

— قدریں چاہے اخلاقی ہوں یا روحانی وتہذیبی اُن کی بحالی کے بغیر ایک خوش گوار و پُروقار زندگی کا حصول ناممکن ہے۔

(مضمون: انجم عثمانی کی کہانی 'وہ ایک بوڑھا' کا تجزیہ)

— تمام علوم وفنون اور فکر وفلسفے کا بنیادی مقصد تو آدمی کو انسانی صفات سے متصف کرنا ہے۔(مضمون: انجم عثمانی کی کہانی 'وہ ایک بوڑھا' کا تجزیہ)

— یہ کائنات ایک خودکار مشین کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک عظیم حکمت وقدرت رکھنے والی طاقت ہے جو اس کائنات کے نظام کو چلا رہی ہے۔

(مضمون: چراغ دل کا جلاؤ بہت اندھیرا ہے)

— مقدّر کا تعلّق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بُری نیت اور بُرے کام کے ساتھ مقدّر کا کوئی تعلّق نہیں ہے۔(مضمون: مقدّر کیا ہے اور کیا نہیں ہے)

— جدید فکر وفلسفے کے باعث یا مختلف ادبی رجحانات کی ہوڑ میں محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال کسی حد تک ترک کر دیا گیا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ محاورات اور ضرب الامثال کی اپنی اہمیت وافادیت رہی ہے۔ زبان کو پُرلطف بنانے یا اُس میں چٹخارہ پیدا کرنے میں محاورات اور ضرب الامثال کا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔(مضمون: شریف احمد قریشی: بحیثیت محقق وشاعر)

— یہ دنیا ایک خود کار مشین کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی ذات کارفرما ہے جو اس پورے نظامِ عالم کو چلا رہی ہے۔

(مضمون: تنویر پھدروا ہی: شخصیت اور شاعری)

درس و تدریس کے باوقار پیشے سے وابستہ ہونے کے سبب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی باذوق قارئین اور طلباء و طالبات کی نفسیات و ذہنیت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی نگارشات سے عوام و خواص بھی محظوظ ہوں اور طلباء و طالبات بھی مستفیض ہوں ۔اسی لیے وہ افسانوی تخلیقات اور مضامین و مقالات کو آسان، عام فہم، دل کش اور پُرکشش پیرایے میں تحریر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تخلیقی نثر لکھتے لکھتے اس قدر پختہ ہوگئے ہیں کہ ان کے یہاں تنقیدی، تحقیقی، معلوماتی ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے مضامین میں بھی تخلیقی نثر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔اُن کے مضامین کے بعض جملے شعریت سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ جنھیں پڑھتے ہی درج ذیل شعراء کرام کے اشعار ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

— جب کسی شخص میں ادبی ذوق و شوق اور محنت و لگن کا جذبہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر کسی بھی تھکان اور کٹھنائی کا احساس نہیں رہتا بلکہ ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

(مضمون: وقارالحسن صدّیقی: حیات اور کارنامے)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
اصغرؔ گونڈوی

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
مرزا غالبؔ

— کتابیں بند الماریوں میں دیمک کی خوراک بن رہی ہیں۔ وہ ترس رہی ہیں کہ انہیں کوئی پڑھنے والا ملے مگر فیس بک جیسی سوتن نے کتاب سے اُس کا قاری

چھین لیا ہے۔(فیس بُک آئی کتاب گئی: تماشوں میں مست ومگن آدمی ہے)

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہ کار پر
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ
شکیبؔ جلالی

— ابتدائے آفرینش سے تحقیق کا جذبہ انسان کی زندگی میں کارفرما رہا ہے کیوں کہ مظاہرِ فطرت کی تمام پوشیدہ طاقتوں کو جاننے ،اُن سے فیضیاب ہونے اور خوب سے خوب تر کی جستجو اور کرید کا جذبہ فطری طور پر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔(مضمون:جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جاکر نظر کہاں
الطاف حسین حالیؔ

— دراصل آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے،اُسے انسان بننے کے لیے کافی وقت لگتا ہے۔لوگ آسان سمجھتے ہیں آدمی سے انسان بننا۔

(مضمون:تنویر بھدرواہی:شخصیت اور شاعری)

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
مرزا غالبؔ

— انجم عثمانی نے اپنے افسانوں میں زندگی کی صداقتوں کو فنّی جامہ پہنایا ہے۔اُن کے بیشتر افسانوں میں انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور یادِ ماضی عذاب ہے یارب کا احساس جاگزیں ہے۔(مضمون:انجم عثمانی کی کہانی 'وہ ایک بوڑھا' کا تجزیہ)

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
(اخترؔ انصاری)

مجموعی اعتبار سے اس مجموعہ کے تمام مضامین نہ صرف لائقِ مطالعہ ہیں بلکہ قارئین کو دعوتِ غور وفکر بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی عہدِ حاضر کے ایک ایسے معتبر قلم کار ہیں جو شہرت وناموری ، اعزازات وانعامات اور ادبی گروہ بندی سے بے نیاز نہایت سرگرمی، مستعدی اور سنجیدگی سے اپنے علمی، ادبی اور تخلیقی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ وہ بعض رعب ڈالنے والے پیشہ ور قلم کاروں کی طرح بھاری بھرکم اصطلاحات کا نہ تو استعمال کرتے ہیں اور نہ وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ شستہ، آسان اور عام فہم اسلوب کے ذریعہ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہ اعتبارِ زبان وبیان نہ صرف پختگی کی طرف گامزن ہیں بلکہ ان کے یہاں خیالات وفکر کی گیرائی وگہرائی اور تجزیاتی قوّت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

☆☆☆

مقدّر کیا ہے اور کیا نہیں ہے

قسمت، تقدیر اور مقدّر یہ تینوں الفاظ بالعموم ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں۔ ان سے مراد انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہیں۔ یہ موضوع بحث طلب نہیں ہے بلکہ غور طلب ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ آدمی کے بُرے افعال کا تعلق مقدر کے ساتھ جوڑنا سراسر حماقت ہے۔ بُرے اعمال، بُری باتیں، بُرے طور طریقے، بُری نیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دراصل قسمت، مقدر اور تقدیر کا تعلق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دُنیا کے بُرے لوگ اپنی تمام بداعمالیوں کو نوشتۂ تقدیر خیال کرتے ہیں یعنی اُن کے خیال میں نعوذ باللہ تمام بُرے کام خدا کرواتا ہے۔ انشا اللہ خاں انشا کا یہ شعر دل میں چبھن سی پیدا کرتا ہے کہ

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد خود ہی کریں لعنت کریں شیطان پر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا فرمایا ہے۔ ہر آدمی اپنے جسم ہی پر نظر دوڑائے تو اُسے اپنے تمام اعضائے بدنی سر سے لے کر پیر تک بڑے خوب صورت اور مناسب مقام پر نظر آئیں گے یعنی دو آنکھیں، ناک، منہ، پیشانی، دو کان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں اور دو پیروں کے علاوہ پورے وجود کے اندر بے شمار جسمانی نعمتیں ہیں کہ جن کا شمار کرنا آسان نہیں ہے اور پھر دل ودماغ کی ہمارے جسم میں کیا حیثیت ہے وہ سب

جانتے ہیں۔ دل چاہنے کا کام کرتا ہے اور دماغ فیصلے کا کام کرتا ہے۔ دل اچھا، بُرا سب چاہتا ہے لیکن دماغ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دل کی وہی بات مانے جو جائز ہو صحیح ہو۔ ہم ذرا لمحہ بھر کے لیے سوچیں کہ اگر اللہ تعالےٰ نے ہمارا منہ سر کی پچھلی جانب رکھوایا ہوتا تو ہمارا کیا حال ہوتا یا اسی طرح دوسرے اعضا فرشتوں سے ادھر اُدھر رکھوا دیے ہوتے تو ہم کتنے بھدے لگتے اور کتنی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا اور پھر کرم پہ کرم یہ دیکھیے کہ انسانی شکل وصورت میں پیدا فرمایا کسی اور مخلوق میں پیدا فرمایا ہوتا تو ہماری کیا پیش چلتی۔ دُنیا کی بے شمار نعمتوں کے علاوہ ایک عظیم نعمت یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمت میں پیدا فرمایا۔ ایمان جیسی دولت نصیب فرمائی۔

قرآن حکیم اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہء حیات ہے جو اللہ نے اپنے پیارے اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے پاک کلام میں اپنی حکمت وقدرت، رحیمی وکریمی، جباری وقہاری، انسان اور کائنات کو پیدا فرمانے کی غرض وغایت، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے کی امتوں کے احوال اور اپنی بے شمار نعمتوں کا ذکر بڑی فصاحت وبلاغت کے ساتھ فرمایا ہے۔ سورہ رحمٰن میں اللہ تعالےٰ نے اپنی گونا گوں نعمتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بار بار فرمایا ہے کہ ''اے جن وانس! تُم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے'' انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کی صورت میں اپنے احکامات محفوظ فرمائے۔ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خاتم النّبین اور رحمتُ اللّعالمین بنا کر مبعوث فرمایا کہ جن کے پاکیزہ اور نُورانی طریقوں میں سو فیصدی کامیابی ہے اور اُن کے طریقوں سے ہٹ کر سو فی صدی ناکامیابی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صراحت وضاحت بڑے دلائل کے ساتھ فرمائی ہے یعنی وہ کام کہ جو اللہ کو پسند ہیں انھیں کرنے کا حکم دیا ہے اور جو کام اللہ کو ناپسند ہیں اُنھیں نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ غرضیکہ ماں کی گود سے لے کر قبر کی گود میں جانے تک اللہ تعالےٰ نے اپنے پیارے اور لاڈلے محبوب حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وساطت سے انسان کو

مقصد حیات و کائنات اور مرنے کے بعد جنت یا جہنم کا مستحق بننے کا پورا فلسفہ سمجھا دیا ہے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ یہ دُنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ ہر آدمی کی زندگی بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے کہ یہ بار بار ملنے والی نہیں ہے۔ ہر ایمان والے کو یہ بھی معلوم ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں فرشتوں نے تین سوال پوچھنے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ تیرا رب کون ہے؟ دوسرا سوال تیرا دین کیا ہے؟ اور تیسرا سوال یہ کہ تیرا نبی کون ہے؟ ہم ذرا غور کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم وکریم ہے۔ عالم برزخ میں انسان سے کیا کچھ پوچھا جائے گا۔ وہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تا کہ انسان اُس کی تیاری میں لگ جائے۔ اپنے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعے علم وآگہی کے سارے دروازے کھول دیے۔ تا کہ کل کو انسان یہ حجت پیش نہ کرے کہ مجھے تو علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ کوئی آدمی اُس کی بے شمار نعمتیں کھائے اور کسی دوسرے کے گُن گائے۔ اس لیے آدمی کی زندگی کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی ہے۔ بقول مولانا رومیؒ:

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان والے گھرانے میں بچے یا بچی کو چھوٹی ہی عمر میں کلمہ طیبہ پڑھایا جاتا ہے کہ ”نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں“۔ اس کے بعد ایمان مفصل اور ایمان مجمل کے بول سکھائے جاتے ہیں۔ ایمان مفصل کا ترجمہ یہ ہے کہ ”میں ایمان لایا اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اچھی بُری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر“ ایمان مجمل کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے ”میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور اپنی صفتوں کے ساتھ ہے اور میں نے اُس کے سارے حکموں کو قبول کیا۔ زبان سے اقرار ہے اور دل سے یقین ہے۔“

ایمان کے یہ بول بولنے کے بعد ایک آدمی کا ذہنی وروحانی رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ساتھ جڑ جاتا ہے گویا وہ ایک بہت بڑا اقرار کرتا ہے کہ اللہ ہی اُس کا خالق

و مالک ہے۔ تمام مقرب وغیر مقرب فرشتے اُس کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے جو آسمانی کتابیں یعنی توریت، زبور اور انجیل اُتری ہیں اُن کو اللہ کی کتابیں مانتا ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی رسول آئے سب پہ ایمان لاتا ہے، روزِ محشر پر اور اچھی بُری تقدیر پر ایمان لاتا ہے کہ وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے اور آخر پر یہ یقین بھی دل میں بسا لیتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت کے دن پھر زندہ ہونا ہے۔ اسی طرح ایمان مجمل میں بھی وہ اﷲ پر اُس کے کے ناموں اور صفتوں کے ساتھ ایمان لاتا ہے۔ بندہ یہاں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سارے حکموں کو قبول کرتا ہے۔ ایمان میں داخل ہونے کے بعد یہ گنجائش ہی نہیں رہتی کہ ایک آدمی جس نے اللہ تعالےٰ کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا زبان سے اقرار کیا ہو اور دل سے تصدیق کیا ہو اُس کے بعد وہ رب چاہی زندگی کے بدلے من چاہی زندگی گزارے۔ اتنے بڑے اقرار کے بعد اب اُس کے ذہن و دل میں کسی بھی بُرے کام کا خیال تک نہیں آنا چاہیے۔ اُس کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے ذکر اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں میں گزرنا چاہیے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ ان آنکھوں سے کیا دیکھنا ہے اور کیا نہیں دیکھنا ہے۔ کان دیئے، دماغ دیا، دل دیا، زبان دی، ہاتھ پیر دیئے غرض بے شمار نعمتیں دیں اور یہ روک لگادی کہ یہ تمام اعضائے بدنی میرے حکموں کے مطابق کام کرنے چاہیں۔ بُرے کاموں کو اللہ تعالےٰ ناپسند کرتا ہے اور اچھے کاموں کو پسند کرتا ہے۔ پورے قرآن پاک اور احادیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات ایک انسان کو اچھے کام کرنے پر زور دیتی ہیں اور بُرے کام کرنے سے منع کرتی ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کہ جب انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی حیرت انگیز ترقی نے قرآن وحدیث کی تعلیمات سے عوام النّاس کو ہر طرح سے آگاہ کردیا ہے اور عالمی معلومات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے یعنی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اللہ تعالےٰ کی نافرمانی میں زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نورانی طریقوں

کو چھوڑ کے جی رہے ہیں۔ لاپرواہی، بے فکری کے ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں۔ حیرت اور دُکھ کی بات یہ کہ اُن تمام اپنے بُرے کاموں کو مقدر سے تعبیر کرتے ہیں۔

زندگی کے سفر میں انسان چند غیر اختیاری اور نامعلوم معاملات سے گزرتا ہے یعنی چند ایسی باتیں کہ جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے، انسان کو نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بچّہ جب بڑا ہو جائے گا تو اُس کی شادی کہاں ہوگی، کس لڑکی کے ساتھ ہوگی۔ دوسرا شادی کے بعد پہلے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ تیسری بات یہ کہ کس شخص کی موت کب، کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ چوتھی بات یہ کہ کل کیا ہوگا۔ پانچویں بات یہ کہ بارش کب آئے گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق علم غیب سے ہے اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اب یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مختلف مثالوں سے یہ واضح کر دیا جائے کہ مقدر کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ جیسے کہ شروع میں ہی یہ کہا گیا کہ مقدر کا تعلق نیک ارادے میں کامیابی یا ناکامیابی سے ہے۔ بُری نیت اور بُرے کام کے ساتھ مقدر کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی امیر گھر میں جا کر چوری کرے اور اُس نے اپنے اس بُرے خیال کو عملی طور پر انجام دیا۔ اُس نے چوری کر لی۔ اُس کے اس مجرمانہ عمل کو مقدر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی شراب پینے کا عادی ہے اور وہ یہ جانتا بھی ہو کہ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، مزید یہ کہ وہ اس ام الخبائث کے مضر اثرات سے بھی واقف ہو لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنا نشہ پورا کرتا ہے تو اُس کے اس فعل بد کو مقدر نہیں کہہ سکتے۔ فرض کریں کسی آدمی کو ڈاکٹر نے سگریٹ پینے سے منع کیا ہے لیکن وہ عادت پہ مجبور ہونے کی صورت میں سگریٹ پیتا ہے اور کھانستے کھانستے اُس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اُسے جب کوئی عقل مند آدمی یہ پوچھے کہ آپ یہ سگریٹ تمباکو کیوں پیتے ہیں؟ تو اُس کا جواب یہ ہو کہ یہ میرے مقدر میں لکھا ہوا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ مقدر نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آپ پہ خود ظلم کر رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال سے مقدر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے وہ یہ کہ فرض کریں آپ نے کسی معمولی یا غیر معمولی سرکاری یا غیر

سرکاری ملازمت کو حاصل کرنے کے لیے فارم بھرا۔ آپ نے کافی محنت کی، آدھی رات تک پڑھتے لکھتے رہے۔ پورے مقتضیات اور شرائط کے ساتھ آپ اُس پوسٹ کے لیے بالکل مناسب اُمیدوار ٹھہرتے ہیں لیکن یہی پوسٹ رشوت یا سفارش کی بنیاد پر کسی اور اُمیدوار کو مل جاتی ہے تو اس دھاندلی کو آپ مقدّر نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ آپ کی حق تلفی ہے، ظلم وزیادتی ہے۔ اسی حوالے سے ایک اور مثال وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی رشوت کے روپے سے بہت بڑی اُونچی حویلی تعمیر کرواتا ہے اور گیٹ پہ لکھواتا ہے کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ رب کا فضل نہیں ہے بلکہ وہ رشوت کو مالِ غنیمت سمجھ کر اپنی خوش نصیبی تصور کر رہا ہے۔ اسی طرح حقوق اللہ کی بات کریں تو اس معاملے میں بھی جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، بغیر شرعی عذر کے روزہ نہیں رکھتے، عشر و ذکواۃ نہیں دیتے، توفیق کے مطابق حج نہیں کرتے اتنا ہی نہیں بلکہ گناہ کے بغیر وہ سانس نہیں لیتے تو سمجھ لیجیے کہ اُن کی یہ باغیانہ روش اُن کا مقدّر نہیں ہے۔ غرضیکہ وہ تمام خبائث کہ جن سے احتراز برتنے یا بچنے کی تلقین قرآن وحدیث میں آئی ہے اور آدمی اُن کو جانتے ہوئے بھی اپنے نفس کو جھوٹی تسکین دینے کی خاطر کر رہا ہے تو وہ تمام اعمالِ بد ہرگز مقدر نہیں کہے جاسکتے، کیونکہ یہ دُنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزا۔ شاعر میر انیسؔ کے یہ صداقت آمیز اشعار ذہن ودل کے روشندان کھول دیتے ہیں کہ:

کیا کیا دُنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

اب کچھ مثالیں ایسی بھی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جن کا تعلق واقعی مقدّر سے ہے۔ مثال کے طور پر ایک کسان کے پاس مختلف پھلدار پیڑوں کا باغ ہے اور وہ ہر سال اپنے باغ کے چوتھائی حصے کے پھل غریب ومسکین لوگوں کو مفت میں بانٹ دیتا ہے لیکن ایک سال ایسا بھی آیا کہ پیڑوں پہ پھل تیار ہونے سے پہلے ہی موسمی خرابی کے

سبب اُن پیڑوں پہ زوردار اولے پڑے جس کی وجہ سے ایک بھی پھل کسان کو نصیب نہ ہوسکا۔ یہ کسان کا مقدر ہے۔ دوسری ایک اور مثال یہ کہ آپ بازار میں سے پیدل چل رہے تھے کہ اچانک آپ کی نظر ہزار ہزار روپے کے دس نوٹوں پر پڑی آپ نے انھیں فوراً اٹھالیا آپ بہت خوش ہوئے۔ آپ جب گھر سے بازار کی جانب نکلے تھے تو آپ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ مجھے بازار میں سرراہ دس ہزار روپے نظر آئیں گے۔ یہ آپ کا مقدر ہے۔ فرض کیا آپ نے آئی اے ایس کا فارم بھرا آپ نے بہت زیادہ محنت کی پہلا اور دوسرا امتحان آپ نے پاس کردیا اور زبانی امتحانی کے دن آپ سخت بیمار پڑ گئے۔ آپ کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا آپ آئی اے ایس کا زبانی امتحان نہیں دے پائے۔ یہ آپ کا مقدر ہے۔ آپ نے گائے یا بھینس دودھ کے لیے خریدی، بہت اچھا دودھ دیتی تھی، دو مہینے کے بعد وہ بیمار پڑ گئی لاکھ کوشش کرنے کے بعد بھی وہ نہیں بچ پائی، مرگئی۔ یہ آپ کا مقدر ہے۔ اسی طرح کی کئی اور مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اب یہاں ایک خاص بات یہ ذہن نشین رہے کہ نیک ارادوں میں منفی نتائج آدمی کو وقتی طور پر مایوس کرتے ہیں لیکن اللہ کی مصلحتوں کو اللہ تعالےٰ بہتر جانتا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس ایک ناکامیابی کے پیچھے اللہ تعالےٰ نے ہمارے لیے کتنی کامیابیاں چھپا رکھی ہوں۔ حاصل غور وفکر یہ کہ آدمی کو ہر نیک کام کرنے میں پہل کرنی چاہیے اور فیصلہ اللہ تعالےٰ کی ذات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آج کل کے دور میں دُنیا میں جتنے بھی جرائم ہورہے ہیں یہ سب آدمی کے نفس امارہ کی وجہ سے ہورہے ہیں۔ کاش! ہر شخص اپنے اندر اوصاف حمیدہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سماجی برائیاں، ذہنی الجھنیں اور تشویشناک ماحول جو ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے یا جس کے باعث زندگی مفلوج ہو کے رہ گئی ہے ہرگز نہ دیکھتے۔ علامہ اقبالؔ نے دراصل بہت پہلے تو ہم پرستی اور ذہنی کسل مندی کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

....

شہنشاہِ ظرافت: مشتاق احمد یوسفی کی ابدی خاموشی

ہمارے اردو ادب میں طنز و مزاح کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ کئی قد آور ادیبوں نے اس پُر لطف صنف ادب کو اپنایا ہے اور عوام کو اپنے اپنے طور پر ہنسایا ہے۔ ایسے بلند پایہ ادیبوں میں رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا اور کرنل محمد خان بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے اگر چہ ان سب سے کسب فیض حاصل کیا ہے مگر ان کی ظرافت کا انفراد یہ ہے کہ انھوں نے مزاح کی مغربی روایت کو مشرقی تہذیب وتمدن میں انگیز کر کے ایک نیا لب ولہجہ اور اسلوب ایجاد کیا ہے۔ دراصل مشتاق احمد یوسفی مزاحیہ ادب میں یونہی مشہور نہیں ہو گئے ہیں بلکہ ان کے اسلوب میں ایسا جادو ہے جو ہر کسی کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ انھیں زبان اور انداز بیان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے شہرت کے بدلے معیار کو اہمیت دی ہے۔ ان کی درجنوں تصانیف نہیں ہیں بلکہ کُل پانچ تصانیف ان سے منسوب ہیں مگر پانچوں معرکتہ الآراء کا درجہ رکھتی ہیں ''چراغ تلے'' خاکم بدہن'' ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں ''زرگزشت'' ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے جبکہ ''آب گم'' پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں ان کی قہقہہ زاری روتے ہوؤں کو ہنساتی ہے۔ ان کی ظریفانہ طبعیت کا آخری تحفہ ''شام شعر یاراں'' ہے جس میں ایسے مضامین شامل ہیں جو کسی تقریب یا سیمی نار میں پڑھے گئے ہیں۔ دراصل ایک بڑا مزاح نگار یا طناز گہرے سماجی شعور کا حامل ہوتا ہے۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ انسان کی

ان تمام نفسیاتی اور سماجی کمزوریوں اور ناہمواریوں پر مزاحیہ پیرائے میں چوٹیں کرتا رہتا ہے تاکہ عوام وخواص کو اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملے۔ مشتاق احمد یوسفی نے یہی کام کیا ہے۔ ان کی ظرافت ان کے گہرے سماجی شعور اور روایات سے ابھرتی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر مزاحیہ جملے سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی زندگی کے متضاد پہلوؤں کی طرف بڑے معنی خیز اشاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے مزاح پیدا کرنے کا ہنر آتا ہے۔ ان کے مضامین شگفتگی، ادبی وقار اور مزاحیہ لطف اندوزی کے پروردہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جہاں کلاسیکی روایت کا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ کا خیال رکھا تو وہیں جدید ادب کے رویّوں اور ہندوستان و پاکستان کی علاقائی زبانوں کی تازگی اور توانائی نے بھی ان کے فکروفن پر گہرے اثرات مرتب کر کے انھیں فنی اعتبار سے ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ مزاح کے جتنے بھی حربے ہیں سب مشتاق احمد یوسفی نے بحسن وخوبی استعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسالیب ظرافت میں مزاحیہ ماجرا نگاری، کردار نگاری، لفظی مزاح، تحریف نگاری یعنی پیروڈی، موازنہ اور علم بیان کے علاوہ قول محال کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ بقول شہاب ظفر اعظمی:

> ''مشتاق احمد یوسفی کو زندگی کے ہمہ جہت رنگوں کو پرکھنے اور برتنے کا ایک وسیع تناظر ملا۔ وہ ٹونک راجستھان میں پیدا ہوئے، جے پور، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی، کراچی میں بینک کاری کے پیشے سے منسلک ہوئے اور دس سال تک زندگی کے گوناگوں تجربات حاصل کیے۔ ان تجربات میں سب سے اہم بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنا اور ان کی نفسیات سے واقف ہونا ہے۔ وہ کوئی منظر دکھائیں یا واقعہ سنائیں، خود اس منظر یا واقعے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں دردمندی و دلسوزی کی ایک زیریں لہر ہمیشہ موجود رہتی ہے''1

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا سب سے بڑا اختصاص ان کا مشاہدہ ہے۔ کسی بھی

موضوع کو زیر بحث لانے کے دوران وہ موضوع کی باریک سے باریک جزئیات کو سانچے میں ڈھالتے ہیں ان کے جملے نپے تُلے ہوتے ہیں۔ ان کے تجربات ومشاہدات اور محسوسات کے بیان کرنے کا انداز اتنا انوکھا اور منفرد ہے کہ کوئی بھی ان کی ہمسری نہیں کر پایا۔ وہ اپنے مزاح کی برجستگی پر خصوصی دھیان دیتے ہیں۔ وہ ایسے جملے تراشتے ہیں کہ ان کا قاری ہنستا بھی رہے اور زندگی کی تلخیوں اور صداقتوں سے واقف بھی ہوتا رہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے جو کچھ بھی لکھا وہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی قہقہہ زار تحریروں سے ماخوذ کچھ جملے ملاحظہ کیجیے:

1۔ یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹا نہ جا سکے۔

2۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں رہتا ہے اور پاگل کُتّے کا زہر زبان میں، انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔

3۔ بدصورت انگریز عورت نایاب ہے۔ بڑی مشکل سے نظر آتی ہے یعنی ہزار میں ایک، پاکستانی اور ہندوستانی اسی سے شادی کرتا ہے۔

4۔ یہ بات ہم نے شیشم کی لکڑی، کانسی کی لُٹیا، بالی عمریا اور چگی داڑھی میں ہی دیکھی کہ جتنا ہاتھ پھیرو اتنا ہی چمکتی ہے۔

5۔ آسمان کی چیل، چوکھٹ کی کیل اور کورٹ کے وکیل سے خدا بچائے ننگا کر کے چھوڑتے ہیں۔

6۔ خون، مشک، عشق اور ناجائز دولت کی طرح عمر بھی چھپائے نہیں چھپتی۔

7۔ پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔

8۔ آدمی ایک بار پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی رہتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔

9۔ مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابل ستائش ہیں کہ انھیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

10۔ مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

11۔ جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔

12۔ محبت اندھی ہوتی ہے، چنانچہ عورت کے لیے خوب صورت ہونا ضروری نہیں۔ بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہے۔

13۔ بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں، سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑھتی ہے۔

14۔ مرد پہلے بحث کرتے ہیں پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے ثانی الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

15۔ منٹو کے افسانوں کا ترجمہ اگر مولانا آزاد کی جناتی زبان میں کر کے طوائفوں کو بالجبر سنایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک ہی صفحہ سن کر کان پکڑ لیں اور اپنے دھندے سے تائب ہو جائیں۔

16۔ چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں نہ پردۂ ساز اور نہ اپنی شکست کی آواز درحقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ آواز بند ہو جاتی ہے۔

....

یہ ہیں مشتاق احمد یوسفی کے جملے، جن میں مزاح کی گدگداہٹ تو ہے ہی، طنز کی گہری کاٹ بھی ہے۔ ایسے دلچسپ اور پُر لطف طنز و مزاح نگار ادیب مشتاق احمد یوسفی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اردو دنیا نے 2018ء میں شہنشاہِ ظرافت کو کھو دیا ہے۔ یوسفی صاحب کی پہنچ اردو نثر کی معراج کمال کہی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے حوالے سے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا ہے۔ جو بلاشبہ عالمی ادب کے سامنے فخریہ طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ صداقت یہ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے پیچھے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ انھیں اردو ادب کی مزاحیہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ وہ ہمیں اپنی پُر

مزاح اور شگفتہ تحریروں میں فطرت انسانی اور انسانی نفسیات کے ایسے نباض اور مشاہدہ کار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جنھیں اپنے فن پر کمال حاصل ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد وممتاز رہے ہیں۔ انسانی فہم وفکر اور سماجی زندگی کے روزمرہ واقعات کو جس دلچسپ ودلآویز زبان وبیان کے ساتھ انھوں نے بیان کیا ہے وہ کسی دوسرے مزاح نگار کے یہاں ہمیں نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر خاور ہاشمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مشتاق احمد یوسفی کو محض مزاح نگار اور طنز نگار ثابت کرنا دلیل کم نظری اور اس فن کو ایک جوئے کم آب بنا دینے کے مترادف ہے۔ وہ انسانی فطرت اور نفسیات کا نبض شناس ہے۔ مصّور فطرت ہے، اپنے قاری کے رگ وپے میں روح بن کر سما جاتا ہے۔ جہاں چاہتا ہے رُلا دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے۔ پڑھنے والا نہ آنسو روکنے پر قادر ہے نہ قہقہے روکنے پر۔ آنسوؤں اور قہقہوں سے ہی زندگی کے عنوان بنتے ہیں، اس کے مفہوم نکلتے ہیں۔ یوسفی کے یہاں علم و مشاہدہ یکساں وسیع اور ہمہ گیر ہیں،۔ علم مشاہدے کے بغیر اور مشاہدہ علم کے بغیر ہو تو شاہکار پیدا نہیں ہوتے۔ وہ خون جگر پیدا نہیں ہوتا جس سے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ اسے پڑھ کر زندگی کی برکتوں اور عظمتوں کا احساس وعرفان تازہ وتوانا ہوتا ہے۔ یوسفی کو پڑھ کر ہزار شیوہ زندگی کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اُس کے پاس طنز کے تیر ونشتر بھی ہیں اور ایک سنجیدہ مزاح بھی''2

اس میں کوئی بھی دورائے نہیں ہے کہ مشتاق احمد یوسفی شہنشاہ ظرافت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے انتقال سے یوں لگتا ہے کہ جیسے اردو ادب کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ مانا کہ ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے لیکن ان کے جانے سے اردو طنز ومزاح کی دنیا میں جو سناٹا اور خاموشی چھائی ہوئی ہے وہ ابدی خاموشی کہی جا سکتی ہے، وہ اس لیے کہ نئی نسل میں اب مشتاق احمد یوسفی جیسا با کمال مزاح نگار نظر آنا ناممکن ہے۔ یہ بات بھی مسلّمہ

ومصدقہ ہے کہ ایک بڑے قلمکار اور ادیب کی موت علم و ادب کا بہت بڑا خسارہ ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا آفاق کی منزل سے گزرنا ناقابل تلافی اور دائمی عدم موجودگی کے غم میں مبتلا کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ان معدودے چند قلمکاروں میں شمار ہوتے ہیں جو اردو کے لیے باعث صد افتخار تھے، جنھوں نے اپنی بے مثال ولازوال طنزیہ ومزاحیہ تحریروں سے اردو کے گنجینے کو مالا مال کیا ہے۔ ایک ایسا شخص کہ جس کی مزاحیہ طبعیت سے محفلیں قہقہہ زار بن جاتی تھیں، زندگی کی الجھنوں سے پریشان اور سود وزیاں کے غم میں مبتلا لوگ قہقہہ زن ہو جاتے تھے، اس کی دائمی خاموشی سے ادبی محفلیں سُونی ہوگئی ہیں۔ لگتا ہے عمر بھر ہنسانے والا آخر پہ رُلا کے چلا گیا ہے!

....

حواشی:

1۔ شہاب ظفر اعظمی ''منفرد مزاح نگار: مشتاق احمد یوسفی'' مشمولہ۔ ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، شمارہ ستمبر 2018ء ص 21 تا 22

2۔ ''ادب اور قومی زندگی'' مصنف: خاور ہاشمی، ص 58

....

فیس بک آئی، کتاب گئی!

(تماشوں میں مست ومگن آدمی ہے)

دنیا، انسان اور زندگی، تینوں لازم وملزوم ہونے کے ساتھ ہر لمحے اپنی بے ثباتی کا یقین دلاتی ہیں۔ اکثر ہم کہتے اور سنتے رہتے ہیں کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے، زندگی فانی ہے۔ یہ بات حق بجانب ہے کہ دنیا دارالعمل ہے۔ اس میں انسان کی حیثیت ایک کردار کی ہے۔ زندگی کو زندہ دلی سے بھی تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ پیغمبرانہ دور سے لے کر مابعد جدید دور تک دنیا کے تمام علوم وفنون، فکر وفلسفے، علمی ادبی سائنسی اور مذہبی دانشگاہیں آدمی کو ایک بہترین انسان بننے اور اس میں عالمی امن و بھائی چارے، رواداری اور انسان دوستی کے اوصاف پیدا کرنے کی تعلیم وتربیت دیتی آئی ہیں۔ غرضیکہ اس حیات وکائنات میں آ کے ہر آدمی اپنے نیک اعمال سے اپنی اور دوسروں کی زندگی کو خوشحال، باوقار اور کامیاب بنا سکتا ہے یا پھر دوسری صورت میں اپنی بد اعمالیوں کے سبب مایوسی، بے چینی، ذلت ورسوائی اور دوذخ میں جانے والی بنا سکتا ہے۔

اکیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی صدی ہے۔ آئے دن عقل کو خیرہ کردینے والی نئی نئی چیزوں نے آج کے انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ سوشل میڈیا نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں بدل دیا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل فون کی آمد سے جہاں عہد ماضی کے مقابلے میں کئی مشکلیں آسان ہوگئی ہیں۔ تو وہیں کئی ایسے تشویشناک

مسائل پیدا ہو چکے ہیں جن کا کوئی معقول حل نظر نہیں آتا ہے۔ مثلاً موبائل فون کا سب سے منفی استعمال نوجوان کر رہے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں جرائم کا گراف بڑھ گیا ہے۔ انٹر نیٹ کے ذریعے تقریباً ہر عمر اور طبقے کے لوگ گھر بیٹھے بیٹھے پوری دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔ ایمانی ضعف اور خوف آخرت نہ ہونے کی وجہ سے بھاری تعداد بلا لحاظ مرد و زن انٹر نیٹ پہ ایسی سائٹس پہ جاتے ہیں جہاں وہ فحاشی، عریانیت اور حیا سوز رقص ابلیس بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ جب موبائل فون اور انٹر نیٹ ایجاد نہیں ہوا تھا تو لوگ بڑے شوق و ذوق سے علمی و ادبی کتابیں پڑھتے تھے اور ہاتھ سے کتابیں لکھتے تھے۔ بلکہ مقدس کتابیں پڑھنے میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ کتاب خوانی سے ذہنی حظ اور روحانی مسرت و بصیرت حاصل ہوتی تھی۔ علمی و ادبی زبان سیکھنے کا بہتر اور واحد ذریعہ کتاب ہوا کرتی تھی۔ علم و ادب سے جنون کی حد تک لگاو رکھنے والے لوگ ملبوسات کم خریدتے تھے اور کتابیں زیادہ۔ سچ سنیے تو کتابیں انسان کی بہترین ساتھی ہوا کرتی تھیں۔ کتابوں سے دوستی ایک ایماندارانہ اور عالمانہ عمل مانا جاتا تھا۔ سنجیدہ، باذوق اور باادب قسم کے لوگ کتاب کی عظمت، اہمیت وافادیت کو بہتر جانتے تھے، لیکن موبائل فون نے ہم کو مکتوب نگاری سے دور کر دیا اور انٹر نیٹ نے ہم سے کتاب چھینی، فیس بک دے دی۔ کتابیں اب بھی لکھی جارہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی لیکن انھیں پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن گھٹتی جارہی ہے۔ وہ لوگ کہ جو کسی زمانے میں کتاب خوانی کے بغیر مضطرب رہا کرتے تھے، اب وہ بھی کتاب کے بدلے گھنٹوں فیس بک پہ لگے رہتے ہیں۔ کتابیں بند الماریوں میں دیمک کی خوراک بن رہی ہیں۔ وہ ترس رہی ہیں کہ انھیں کوئی پڑھنے والا ملے مگر فیس بک جیسی سوتن نے کتاب سے اس کا قاری چھین لیا ہے۔ میں یہاں مشہور فلمی نغمہ نگار جناب سمپورن سنگھ گلزار کی ایک آزاد نظم ''کتابیں'' بطور حوالہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جس میں انھوں نے انٹر نیٹ کے بڑھتے رُجحان کے باعث کتاب سے دُوری اور اُس سے لطف اندوزی کو بڑے دلکش شاعرانہ پیرایے میں یوں بیان کیا ہے:

''کتابیں جھانکتی ہیں بند الماریوں کے شیشوں سے

بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں اب اکثر
گزر جاتی ہیں کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں
انھیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
جو قدریں وہ سناتی تھیں
کہ جن کے سیل کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں

وہ سارے ادھڑے ادھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں
جو مٹی کے کٹوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انھیں متروک کرڈالا
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحے پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے بس اک
جھپکی گزرتی ہے
بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر

کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کے لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا آئندہ بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول اور
مہکتے ہوئے رقعے
کتابیں مانگنے، گرنے، اٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
ان کا کیا ہوگا؟
وہ شائد اب نہیں ہوں گے!!!''

بچے جوان، بوڑھے مرد و عورتیں تقریباً سبھی فیس بُک کے قیدی ہو کے رہ گئے ہیں۔ اللہ معاف کرے ایک طرح کے اسیرِ ہوس۔ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے، اچھے لگنے اور نئے نئے رنگ روپ بدلنے کی چاہت میں خودنمائی کے احمقانہ جذبے کے ساتھ ہر روز نہیں، ہر دو گھنٹے کے بعد فیس بُک پہ جلوہ افروز ہوتے ہیں اور پھر فیس بُک پہ کیا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اچھا بُرا سب ایک ساتھ۔ اچھا تو لوگ کم ہی دیکھتے ہیں۔ بُرا دیکھنے والوں اور اس پہ اپ لوڈ کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ تفریحِ طبع کے لیے سینما دیکھنے جاتے تھے، لیکن اب ہاتھ پہ سینما آ گیا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ فیس بُک بینی کسی بھی بڑے اور بُرے نشے سے کم نہیں ہے۔ جب کوئی بھی آدمی فیس بُک کھولتا ہے تو اسے اپنے ہر دوست کے سوانح اور دیگر کوائف دیکھنے، جاننے کی للک رہتی ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ طرح طرح کی ویڈیوز، جو وحشت و بربریت، جنسی برانگیختگی، فرقہ پرستی اور اشتعال انگیز تقریروں پہ مبنی ہوتی ہیں، بہت حد تک ہماری نفسیاتی دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں۔ ایک شریف النفس آدمی یہ سوچ کے رہ جاتا ہے کہ حیراں ہوں ان دو آنکھوں

سے کیا کیا دیکھوں! پوری دلچسپی اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ فیس بک دیکھنے کے مضر اثرات ہماری جسمانی، نفسیاتی اور روحانی زندگی پہ پڑ رہے ہیں۔ بچّے بالغ ہونے کی عمر سے پہلے ہی بالغ ہو رہے ہیں۔ ایک آزادانہ ذہن کہ جس پہ کوئی قدغن نہیں ہے، بُرائی کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے اور زندگی ہے کہ برف کی سِل کی طرح یا شمع کی مانند وقت کے دھارے میں ختم ہو رہی ہے۔ انسان گردشِ دوراں میں بے بس و مجبور ہے۔ وقت، کو ہم روک نہیں سکتے ہیں۔ یہ وقت ہی ہے جو ایک آدمی کو بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپے اور پھر اسے ایک دن سفرِ آخرت پہ روانہ کر دیتا ہے۔ مشہور نغمہ نگار ساحرؔ لدھیانوی نے وقت سے متعلق کیا خوب کہا ہے:

وقت سے دن اور رات، وقت سے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام، وقت کا ہر شے پہ راج
وقت کی گردش سے ہے چاند تاروں کا نظام
وقت کی ٹھوکر میں ہے کیا حکومت کیا سماج
وقت کی پابند ہیں آتی جاتی رونقیں
وقت ہے پھولوں کی سیج وقت ہے کانٹوں کا تاج
آدمی کو چاہیے وقت سے ڈر کر رہے
کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج

اللہ تعالیٰ کی ذات خالقِ کُل ہے۔ ہر چیز اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ حیوانات، نباتات و جمادات کے علاوہ ارضی وسماوی نظام اپنے پورے مظاہرِ فطرت کے ساتھ ایک منظّم طریقے سے چل رہا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ گویا تمام مخلوقات پہ اسے فوقیت حاصل ہے۔ انسان کو پیدا فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کی ضروریاتِ زندگی کا سامان پیدا کر دیا ہے اور اس پر سب سے بڑا کرم یہ فرمایا کہ اسے بہتر، خوشحال اور دنیا و آخرت میں کامیاب زندگی گزارنے کا نصاب بھی قرآن وحدیث کی صورت میں دیا۔ ایک ایسا نبی مبعوث فرمایا جس پہ کروڑوں درود وسلام یعنی محمد عربی صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم پہ۔اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو یہ وارننگ ہے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے! کتنی زبردست جمودتوڑ سچائی ہے، لیکن اس کے باوجود ہماری بے فکری، دنیا طلبی اور نفس پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہم تمام خباثتوں کے ساتھ جی رہے ہیں۔ ہائے حسرت وافسوس!اس بات پہ کہ ہم قرآن وحدیث نہیں پڑھتے، فیس بُک پڑھتے ہیں! آدھی آدھی رات تک ہمارے نوجوان فیس بُک پہ کیا کیا دیکھتے ہیں اور صبح ان کی آنکھ نہیں کھلتی، نماز قضا کر دیتے ہیں۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے خودکشی، لڑائی جھگڑے، گالی گلوچ، حرام کاری اور چوریاں ہورہی ہیں۔ حدتو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی صحت مند تنقیدی پہلو کو ایک طرف رکھ کر فیس بُک پہ ایسے مخرب اخلاق کمنٹس کرتے ہیں جن میں کسی کی دل شکنی، تضحیک، طنز ورمزاور معرکہ آرائی شامل ہوتی ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ انسان کے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم سے پہلے اس دنیا میں جولوگ آئے تھے اچھے بُرے سب چلے گئے۔ ہم کو بھی جانا ہے اور جو ہمارے بعد آئیں گئے وہ بھی چلے جائیں گے۔ جب یہ صداقت ہے تو پھر ہم کیوں اچھے اور بُرے کا خیال رکھ کر نہیں جیتے۔ کہتے ہیں قبر دن میں کئی بار یہ آواز دیتی ہے کہ میں کیڑوں کا گھر ہوں، میں وحشت وتنہائی کا گھر ہوں، میں نیک اعمال کرنے والوں کو آرام پہنچاتی ہوں اور بُرے اعمال کرنے والوں کے لیے عذاب بن جاتی ہوں۔ گویا جہاں ہمیشہ کے لیے جانا ہے وہاں کی کوئی تیاری نہیں اور دنیا کی یہ غیر یقینی زندگی کہ جس کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اسے یہاں کتنے ماہ وسال جینا ہے اس کی بہت زیادہ فکر ہے۔ بقول حیرت الہ آبادی:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

عقل منداورخوش نصیب ہے وہ آدمی جو مرنے سے پہلے توشۂ آخرت کی فکر میں لگ جائے۔ سائنسی اور تکنیکی چیزیں جو ہمیں میسر ہیں وہ تمام اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، موبائل فون، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ وغیرہ یہ تمام ہماری روزمرہ زندگی کی اہم ترین ضروریات میں شامل ہیں، لیکن مسلہ صرف ان کے جائز وناجائز

استعمال کا ہے۔ بس اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح ہم گھر میں چھُری سے ساگ سبزی اور پھل وغیرہ کاٹتے ہیں، اسی طرح ہم چاہیں تو اُس چُھری سے کسی آدمی کا گلا بھی کاٹ سکتے ہیں۔ غرضیکہ اچھی نیت رکھ کر کوئی اچھا کام کریں گے تو اچھے کہلائیں گئے اور بُری نیت رکھ کر کوئی بُرا کام کریں گے تو بُرے کہلائیں گے۔ لہٰذا ہماری یہ پہلی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ہر کام کرنے سے پہلے اپنی نیت کو ٹٹولیں کہ ہم جو فلاں کام کرنے جا رہے ہیں یہ صحیح ہے یا غلط۔ اس طرح کا ذہن و دل لے کر جب ہم جینے لگیں گے تو یقیناً امن و سکون اور خوشحالی کا ماحول پیدا ہوگا۔ ورنہ جو تشویشناک اور پُرفتن ماحول و معاشرہ ہمارے سامنے ہے اس سے ہم بخوبی واقف ہیں اور اس سے جوجھ رہے ہیں۔ ہم جب آنکھوں سے صحیح نہیں دیکھتے، کانوں سے صحیح نہیں سنتے، دماغ سے صحیح نہیں سوچتے، دل سے صحیح نہیں چاہتے، زبان سے سچ نہ بولنے کے بجائے جھوٹ، دھوکہ وفریب، چاپلوسی، عیّاری، مکّاری، منافقت، حسد، بغض وعناد، غرور وتکبر اور موہ مایہ کے مکڑ جال میں پھنس جاتے ہیں تو اپنے اور دوسروں کے لیے تباہی کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ہمارے غلط اور بُرے کام کرنے کے جو نتائج سامنے آتے ہیں انھیں ہم مقدر کا نام دیتے ہیں۔ گویا یہاں بھی ہم مقدر کو الزام دے کے اپنا دامن بچا کے نکل جاتے ہیں۔

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ سچائی ہے کہ فیس بُک کتاب پہ غالب آ چکی ہے۔ Facebook انگریزی کا لفظ ہے جس کا اردو ترجمہ چہرہ کتاب مناسب رہے گا، لیکن عملی طور پر ہم دراصل محرم وغیر محرم چہروں کو دیکھتے ہیں۔ کتاب، قاری سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسے لفظ لفظ پڑھا جائے مگر وائے حسرتا! ہمیں فیس بُک دیکھنے سے کہاں فراغت! علمی وادبی کتاب پڑھنا تو درکنار، ہمیں تو قرآن مقدّس پڑھنے کی بھی فرصت نہیں! اللہ تعالےٰ اپنے پاک کلام میں فرماتے ہیں:

''قسم ہے زمانے کی، بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے
ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے
کو حق بات کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی''

بہر حال عقل مند ہے وہ شخص جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور ایسے اعمال کیے جو موت کے بعد کام آئیں گے۔اس لیے اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا کر رہے ہیں۔

....

شریف احمد قریشی: بحیثیت شاعر و محقّق

اردو زبان وادب کے فروغ، اس کی ترقی اور خدمات کے سلسلے میں جہاں دبستان دہلی، دبستان لکھنو اور دبستان عظیم آباد نے کلیدی رول ادا کیا ہے تو وہیں دبستان رام پور بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان تمام دبستانوں کا اردو زبان کو نکھارنے سنوارنے میں خاصا عمل دخل رہا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا تعلق رام پور سے ہے۔ وہ اگر چہ 15 جولائی 1953ء کو بمقام قصبہ گھاٹم پور، ضلع کانپور (یوپی) میں پیدا ہوئے لیکن رام پور کی سرزمین نے ان میں علم وادب کے جوہر پیدا کیے۔ ابتدا ہی سے نہایت ذہین اور باصلاحیت رہے ہیں۔ علم وادب سے والہانہ لگاؤ ہونے کی وجہ سے نہ صرف اردو میں ایم اے، بی ایڈ اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی بلکہ ہندی میں بھی ایم اے کیا اور اسکے بعد ''اردو کہاوتوں کی جامع فرہنگ'' کے موضوع پر 2012ء میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی (یوپی) سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایک طویل مدت تک گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب ملازمت سے وظیفہ یاب ہو چکے ہیں۔ موصوف کی شخصیت اردو ادب میں باغ و بہار کی سی ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے محقق ونقاد اور دانشور ہیں بلکہ ایک ایسے شاعر بھی ہیں جن کی شاعری میں گل وبلبل، زلف جاناں اور لب ورخسار کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی حسن وعشق کا بیان ہے بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے غزل کا روایتی معنی ومفہوم بدل دیا ہے۔ ان کی شاعری براہ راست عصری مسائل ومعاملات اور آج کی مشینی زندگی میں انسان کی زبوں حالی اور اقدار کی

شکست وریخت پر دعوت فکر وعمل دیتی ہے۔ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جو قاری کے دل کو چھو لیتے ہیں۔مثلاً ان اشعار پر دھیان دیجیے:

جن کا خمیازہ بھگتنا پڑے نسلو ں کو کبھی
کام ایسے نہ کرو دوستو نادانی میں

....

میں قاتل ہوں تڑپ کا، جوش کا، جذبے کا، گرمی کا
کبھی مردہ دلی کو زندگی کہتے نہیں بنتی

....

غیر پھل پائیں گے خود پھل سے رہیں گے محروم
یہ کہاں سوچتے ہیں پیڑ لگانے والے

....

کروں تسلیم میں کیسے بہار آئی ہے گلشن میں
مجھے تو زرد کونپل کو ہرا کہتے نہیں بنتی

....

وہ دیکھ نہیں سکتا بلند ی پہ کسی کو
ہر مائل پرواز کے پر کاٹ رہا ہے

....

لے کے کہاں جائیں اس دنیا میں حسن سیرت
آج اس شے کی بہت گھٹ گئی قدر و قیمت

خول پہ خول چڑھائے ہوئے پھرتے ہیں سبھی
بے ملمّع نظر آتی نہیں کوئی صورت

....

شریفوں میں شمار اپنا تو اک مدت سے ہے لیکن
شریف اب تک کوئی وصف شریفانہ نہیں آیا

....

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کے ان اشعار پہ دھیان دیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں زندگی کی صداقتوں اور آفاقیت کا بیان موجود ہے۔شاعر کا احساس، مشاہدہ اور تجربہ اپنی فکری رفعتوں کے ساتھ ایک حساس اور سنجیدہ قاری کے دل پہ تازیانے کا کام کرتا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے انسان کی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ واقعی انسان جب وقت پہ دور اندیشی اور دانشمندی سے کام نہیں لیتا ہے تو لمحوں کی خطا صدیوں پہ بھاری پڑتی ہے۔ لہٰذا اس شعر میں شاعر کا ناصحانہ انداز قاری میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ یہ باور کراتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے۔ دوسرے شعر میں شاعر کے ولولہ انگیز جذبے کا دخول زندگی کو زندہ دلی قرار دیتے ہوئے بے حسی کو مردہ دلی سے تعبیر کرتا ہے۔تیسرا شعر انتہائی پر لطف اور خلوص بکراں کا حامل ہے کہ جس میں شاعر کی تعمیری سوچ و تفکر اپنی لطف انگیزی کے ساتھ موجودہ دور کے انسان کی عیّارانہ ذہنیت پر گہرا طنز معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ آج کا انسان نفسا نفسی کے عالم میں جی رہا ہے، اس لیے اس کے دل میں جذبۂ رحم و کرم کا فقدان ہے۔ پیڑ لگوا کر پھل سے محروم رہنا ایک خوب صورت شاعرانہ ترکیب ہے۔ چوتھے شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعر نے صداقت پسندی کے جذبے کو ابھارا ہے، کیونکہ شاعر کا مزاج سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کہنے کا نہیں ہے۔ پانچواں شعر بھی نہایت خوب ہے۔شاعر نے حسد ورشک، بغض وعناد جیسی ذہنی خباثتوں پہ جس شاعرانہ انداز میں طنز کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چھٹے شعر میں حسن کردار اور حسن سیرت کی بے قدری پر شاعر ماتم کناں ہے۔ مغربی کلچر نے انسانی قدروں کو بری طرح پس پشت ڈال کر نفسانی خواہشات کی تکمیل کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ انسانیت کش ہے اور ہر باشعور کے لیے لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساتویں شعر کا تعلق فرد اور سماج کی عیارانہ ذہنیت سے ہے۔ خلوص، سچائی اور نیک نیتی نام کی کوئی بھی قدر باقی نہیں رہی ہے بلکہ شاعر کی نظر میں ہر شخص خود غرضی اور منافقت کا مکھوٹا پہنے پھر رہا ہے۔ آخری شعر

سے شاعر کا احساس عجز وانکساری ابھرتا ہے اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اچھا نام رکھنا اچھی بات ہے لیکن نام کی مناسبت سے شخصی جوہر کا پیدا ہونا بغیر محنت اور صبر کے ناممکن ہے۔ بہر حال شریف احمد قریشی کے ان تمام اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نرم مزاج، وسیع فکر ونظر اور حیات وکائنات میں انسان کی عظمت ورفعت کے قائل ہیں۔ وہ انسانی اقدار کے فقدان پہ ملول ومضطرب معلوم ہوتے ہیں۔ ناصحانہ جذبات واحساسات سے مملو ان اشعار سے شاعر کی انسان دوستی، خلوص اور محبت واخوت کا درس تو ملتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فرد اور سماج کی عیاری، مکاری اور غداری کا ایک دل سوز رخ بھی عیاں ہونے لگتا ہے جو ایک حساس، صاحب فہم وفراست شخص کے لیے مایوسی کے کئی باب کھولتا ہے۔

ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی ایک دیدہ ور محقق ونقاد اور ماہر لسانیات بھی ہیں۔ وہ بہت حد تک اردو ادب سمندر پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی مطبوعہ کتب میں ''فرہنگ روح نظیر'' (1969ء) ''فرہنگ نظیر'' (1991ء) ''فرہنگ فسانہ آزاد اور اس کا عمرانی اور لسانی مطالعہ'' (2000ء) ''دید وباز دید'' (تنقیدی تبصروں کا مجموعہ 2002ء) ''کہاوتیں اور ان کا حکایتی وتلمیحی پس منظر'' (2003ء) ''کہاوت کتھا کوش'' (ہندی) (2005ء) ''تلمیحات نظیر اکبرآبادی'' (2006ء) ''رانی کیتکی کی کہانی کی فرہنگ'' (2008ء) ''رام پور میں اردو افسانہ'' (2009ء) ''رانی کیتکی کی کہانی۔ مقدمہ'' (2010ء) اور ''تیسری آنکھ'' (2010ء) اہم درجہ رکھتی ہیں۔ ان کتب کے عنوانات ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ شریف احمد قریشی نے انتہائی کٹھن اور دقت طلب موضوعات پر کام کیا ہے اور یہ سارا کام بغیر عرق ریزی کے ممکن نہیں۔ یہاں اس حقیقت کا ذکر کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ عصر حاضر میں یونیورسٹیوں میں خاص کر ادبیات کے میدان میں جس طرح کے موضوعات پر تحقیق کروائی جاتی ہے وہ زیادہ تر کسی ادبی شخصیت کی ادبی خدمات سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن شریف احمد قریشی چونکہ ایک کہنہ مشق تخلیق کار ہونے کے علاوہ باصلاحیت تحقیق کار بھی ہیں، اس لیے انھوں نے دقیق موضوع کا انتخاب کر کے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے دوران تحقیق لفظوں کی

معنویت اور موزونیت پر خاص دھیان دیا ہے۔ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوستان کے تقریباً تمام اردو کے اہم رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، آل انڈیا میر اکیڈمی، بزم احباب رام پور، میر انیس لائبریری گھاٹم پور ضلع کانپور، بزم ہم مشرب رام پور کی جانب سے ڈاکٹر شریف احمد قریشی کو ان کی علمی وادبی خدمات کے لیے انعامات واعزازات سے نوازا گیا ہے۔ڈاکٹر موصوف کا علمی وادبی دائرہ کافی وسیع ہے۔ان کی مطبوعہ کتب نہایت ضخیم ہیں اور رسائل وجرائد میں اردو ادب کی قدآور شخصیات پر ان کے مضامین، تبصرے اور تجزیے ادبی لطافتوں، نزاکتوں اور معنی آفرینی کی خوشبو لیے ہوئے ایک سنجیدہ قاری کو جہان ادب کی سیر کراتے ہیں۔ہندی اور اردو ادب سے گہری واقفیت نے ان میں علم وادب کی ایک ایسی جوت جگائی ہے کہ جو ادب کے میدان میں خاص کر تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی۔یقین نہ آئے تو ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی تاریخ ساز کتاب ''کہاوت اور حکایت'' جو بڑی خوب صورت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہے، کا مطالعہ کیجیے تو بخوبی اس بات کا اندازہ ہوگا کہ ان کا تحقیقی نقطۂ نظر کس قدر صاف، واضح، ایماندارانہ، علم وآگہی اور سنجیدگی کا حامل ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی کتاب ''کہاوت اور حکایت'' 768 صفحات پہ مشتمل میری نظروں میں ہے۔زیر نظر کتاب اردو اکیڈمی لکھنو کے مالی تعاون سے 2011ء میں شائع ہوئی ہے۔جس کا صوری ومعنوی حسن جاذب نظر اور پرکشش ہے۔مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب وتہذیب میں تحقیق کار نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ قاری ازاوّل تا آخر کتاب کے مطالعے میں اس قدر مستغرق ہو جائے کہ اس کی دلچسپی بتدریج بڑھتی جائے۔ چنانچہ کہاوتوں اور حکایتوں میں ایک ایسا ربط وتسلسل برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے کسی بھی مقام پر ادبی چاشنی کا تسلسل منقطع نہیں ہوتا۔تمام کہاوتوں کو زیر نظر کتاب کی فہرست میں اس طرح شامل کیا گیا ہے کہ قاری جس بھی کہاوت کو دیکھنا یا سمجھنا چاہے تو بآسانی دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔جدید فکر وفلسفے کے باعث یا مختلف ادبی رجحانات کی ہوڑ میں

محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال کسی حد تک ترک کر دیا گیا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشن رہے کہ محاورات اور ضرب الامثال کی اپنی اہمیت وافادیت رہی ہے۔ زبان کو پر لطف بنانے یا اس میں چٹخارہ پیدا کرنے میں محاورات اور ضرب الامثال کا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔اس ضخیم اور معلومات سے پُر کتاب میں شامل تمام کہاوتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر کہاوت ایک مخصوص تاریخی وسماجی پس منظر سے جڑی ہوئی ہے۔ فاضل مصنف نے حسن ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے سب سے پہلے پیش لفظ میں اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ ''کہاوت اور حکایت'' جیسے مشکل ترین موضوع پر تحقیق کرنے پر ان کے استاد محترم جناب پروفیسر محمد حسن نے تحریک دی جو اردو کے ایک ممتاز ادیب اور دانشور تھے۔ مزید برآں مذکورہ موضوع کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تشکر وامتنان میں ان تمام ادب نواز دوستوں کا شکریہ کیا گیا ہے جنھوں نے مذکورہ کتاب کے مصنف جناب شریف احمد قریشی کو مواد کی فراہمی میں یا موضوع سے متعلق اپنے ذرّیں خیالات سے نوازا ہے۔ ضرب المثل کیا ہے؟ اس سے متعلق ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اردو، ہندی اور انگریزی کے اہم ناقدین اور ماہر لسانیات کے اقوال کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر ایک زبان میں کہاوتوں اور حکایتوں کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہاوت اور ضرب المثل کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تجربات ومشاہدات کا بے کنار سمندر جب چند مخصوص الفاظ کے کوزے میں سما جاتا ہے تو کہاوت یا ضرب المثل کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔مختلف قسم کے نسلی تجربات ومشاہدات، قصص وحکایات، عقائد ونظریات، حقائق وتوہمات، نفسیاتی ردّ عمل وفلسفیانہ خیالات، قوانین وضوابط، پند ونصائح، اقوال وملفوظات، تاریخی ونیم تاریخی واقعات وحادثات، لوک کہانیاں، شعری ٹکڑوں اور دوہوں وغیرہ کے ایسے قول عام کلیدی جملوں، فقروں یا کلمات وغیرہ کو جن میں اختصار اور معنوی زور بھی ہو کہاوت یا ضرب المثل کہتے ہیں''

میرے خیال میں صاحب کتاب نے کہاوت یا ضرب المثل کی جو تعریف کی ہے وہ جامع اور مختصر ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔دراصل ضرب المثل انسانی تجربات ومشاہدات یا نفسیاتی ردِّعمل کا ایک ایسا فوری اظہاریہ ہے جس میں صداقت کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔''کہاوت اور حکایت'' میں کل 1690 کہاوتیں شامل کی گئی ہیں۔دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ہر کہاوت کسی نہ کسی کہانی یا واقعے سے جڑی ہوئی ہے۔جس کی وجہ سے زیرِ نظر کتاب نہایت دلچسپ، بصیرت افروز اور اخلاقی درس کا ایک عمدہ خزینہ معلوم ہوتی ہے۔ شریف احمد قریشی نے نہایت آسان، عام فہم، شستہ اور دلچسپ زبان وبیان کا استعمال کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں کہاوت کا معنی ومفہوم واضح ہونے کے بعد وہ کہاوت کے پس منظر میں پوشیدہ کسی نہ کسی کہانی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے دوسری اہم بات یہ کہ مصنّف نے اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ ایک ایک کہاوت کو مختلف الفاظ سے بیان کیا جاتا رہا ہے یعنی معمولی سے فرق کے ساتھ کہاوتیں نسل در نسل منتقل ہوتی آئی ہیں۔آیئے نمونے کے طور پر''کہاوت اور حکایت'' سے ماخوذ ایک کہاوت ملاحظہ فرمائیں کہ جس میں مصنّف نے نہ صرف اس کا معنی ومفہوم واضح کیا ہے بلکہ اس کہاوت کے پس پردہ حکایت کو بھی بیان کیا ہے۔مثلاً:

> ''ایک آپ، دوسرا بغل چاپ (ال) جب کوئی شخص بغیر بلائے کسی کے یہاں جائے اور اپنے ساتھ ایسے شخص کو بھی لے جائے جس کی خاطر مدارات میزبان کو کرنا پڑے تو کہتے ہیں۔اس کہاوت کے پس منظر میں ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:
>
> ''ایک شخص نے اپنے بیٹے کی برات میں لے جانے کے لیے کچھ لوگوں کو مدعو کیا: برات کے ہمراہ دیگر لوگوں کے علاوہ حجام، درزی اور دھوبی وغیرہ بھی تھے۔لڑکی والے اپنے یہاں دستور کے مطابق ہر مہمان کا حصّہ پوچھ پوچھ کر دے رہے تھے۔جب حجام کا نمبر آیا تو اس نے کئی حصے لینے کی غرض سے حصّہ بانٹنے والے سے کہا: استاد،

حجام، نائی ایک میں ایک میرا بھائی یعنی مجھے پانچ حصے ملنا
چاہیے (جب کہ وہ شخص ایک ہی تھا) اس کے بعد جب درزی کا نمبر
آیا تو اس نے بھی حجام کی طرح کئی حصے دار بتائے۔ آخر میں جب
حصہ لینے کے لیے دھوبی کی باری آئی تو اس نے بھی حجام اور درزی کی
طرح کئی حصے دار گنا دیے۔ اس پر حصہ بانٹنے والے نے کہا ''ایک
آپ دوسرا بغل چاپ''

''کہاوت اور حکایت'' میں شریف احمد قریشی نے اسی طرح تمام کہاوتوں کے معنی ومفہوم کی وضاحت کے ساتھ کسی نہ کسی حکایت یا قصّے کہانی سے مربوط کر کے ترتیب دیا ہے کہ جس طرح مندرجہ بالا کہاوت کو ایک خاص واقعے سے جوڑا ہے۔ مزید برآں کہاوتوں کو حروف تہجی کے تحت شامل کیا گیا ہے تا کہ قاری دوران مطالعہ کسی بھی طرح کی ذہنی الجھن کا شکار نہ ہو۔ بہر حال پوری کتاب کے مطالعے سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ ہمارے اردو ادب میں کہاوتوں یا ضرب الامثال کا کتنا عمدہ سرمایہ موجود ہے۔ کس موقعے پر کون سی کہاوت صادق آتی ہے۔ اس بات کی طرف بھی مصّف نے خصوصی توجہ دی ہے۔ میرے خیال میں زیرِ نظر کتاب ''کہاوت اور حکایت'' شریف احمد قریشی کی برس ہا برس کی محنت ولگن کا نتیجہ ہے کہ جس کے مطالعے سے موصوف کی علمی و ادبی دلچسپی، ذوق وشوق اور وسیع معلومات کا پتا چلتا ہے۔ سہل پسندی بلکہ کسل مندی کے اس دور میں ''کہاوت اور حکایت'' جیسی ضخیم، خوبصورت، معلومات افزا، دقیق اور نئے موضوع پر لکھی کتاب اردو کی نئی نسل کے لیے نمونۂ بلند ہمتی اور محنت شاقّہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ''کہاوت اور حکایت'' کے مصنّف جناب پروفیسر شریف احمد قریشی کو مبارک باد دیتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ وہ آگے بھی اردو زبان وادب کے گلستاں میں نئے گلوں کا اضافہ کریں گے۔

....

اصغر ویلوری کی شعری استعداد

شمالی ہندوستان کی طرح جنوبی ہندوستان میں بھی اردو کی نابغہ روزگار ہستیاں موجود ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دہلی، لکھنو، رام پور، عظیم آباد، حیدرآباد اور دوسری نواحی بستیاں آج بھی اردو تہذیب کا مرکز ہیں۔ لیکن کرناٹک میں کنڑ اور تامل ناڈو میں تلگوزبانوں کا چلن عام ہونے کے باوجود اردو کے عاشقوں کی تعداد ان ریاستوں میں بتدریج بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اصغر ویلوری کا تعلق تامل ناڈو سے ہے۔ ایک کہنہ مشق شاعر بالخصوص رباعی گو شاعر کی حیثیت سے قدآور ہیں۔ اردو ادبی حلقوں میں ان کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے تقریباً پندرہ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں زیادہ تر ان کی رباعیات شامل ہیں۔ اصغر ویلوری کسی کالج یا یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر نہیں رہے ہیں بلکہ وہ تو ریلوے محکمے میں ڈویژنل کمشنر منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں لیکن اردو سے بہت زیادہ مانوس ہونے کی وجہ سے اردو ہی کو اپنے تجربات ومشاہدات اور جذبات واحساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ فی الحال اصغر ویلوری کے دو شعری مجموعے ''کھلے الفاظ'' (2003ء) اور ''منتخب رباعیات اصغر'' (2014ء) میرے پیش نظر ہیں۔ جن کے مطالعے سے میں نہ صرف محظوظ ہوا بلکہ مستفید بھی ہوا۔ موصوف کے مذکورہ شعری سرمائے کی قرات کے دوران میں نے جو کچھ محسوس کیا یا میرے دل ودماغ پہ جس طرح کے تاثرات مرتسم ہوئے انھیں صفحہ قرطاس پہ رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ''کھلے الفاظ'' میں اصغر ویلوری کی غزلیں، رباعیاں اور قطعات شامل ہیں۔ جبکہ ''منتخب رباعیات اصغر'' سے یہ

واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں اصغر ویلوری کی صرف رباعیات شامل ہیں۔

میرے نزدیک اصغر ویلوری معاصر اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ دراصل ان کی شعری جہات نے انھیں ایک ایسے بلند مقام پہ لا کھڑا کیا ہے جس مقام کو حاصل کرنے میں ان کے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور آفاقی نوعیت کے تفکر و تدبر کا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ مزید برآں میرے لیے یہ بات باعث مسرت ہے کہ اصغر ویلوری کے پاس مومنانہ وضع قطع اور سوچ کے ساتھ آدمی کو انسانی صفات سے متصف دیکھنے کی للک موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ معرفت الٰہیہ، عقیدت وعظمت محمد یہ ﷺ کے علاوہ متصوفانہ جذبات واحساسات کا غماز ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے سینکڑوں اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں اور حالات ووقت کی ستم ظریفیوں پہ ان کی گہری نظر رہی ہے۔ اپنی مخصوص دھنک رنگ فکر ونظر سے انھوں نے حیات وکائنات میں وقوع پذیر حالات وواقعات کو نہایت موثر شعری جامہ پہنایا ہے۔ ان کا کلام ان کی آپ بیتی ہوتے ہوئے بھی جگ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اصغر ویلوری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اصغر صاحب کے کلام میں بے شک کلاسیکی شعرا کی طرح مضامین کے تنوع اور کہیں کہیں مضمون آفرینی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کا کلام واردات قلبی کا آئینہ دار ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں ایک خاص کیفیت اور سادہ و پرکار اسلوب شعری کی گرفت میں رہتی ہیں۔ اس تاثر کی ترسیل میں کبھی کبھی ردیف بھی معاون ہوتی ہے۔''

(''کھلے الفاظ''اصغر ویلوری۔ سرمدی پبلیکیشنز موہن داس لین چنئی 2003ء ص 12)

اصغر ویلوری نے روایتی شاعری کا پاس ولحاظ تو رکھا لیکن موضوعاتی تنوع ان کے کلام میں ایک نئے لب ولہجے کے ساتھ موجود ہے۔ یعنی انھوں نے غزل، نظم، قطعہ اور رباعی کے ہیئتی آہنگ کا خاص خیال رکھا مگر موضوعاتی طور پر ان کی غزلیہ شاعری میں حسن

وعشق، گل وبلبل، رقص وسرود، نسائی لب ورخسار اور زلف وکاکل کا ذکر نہیں ہے بلکہ انھوں نے عصری معاشرے کی منافقانہ ذہنیت اور حیات انسانی کے پیچیدہ مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عمل صالح کو امن وسلامتی کا ضامن قرار دیتے ہوئے مخلوق کے بدلے خالق سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے کلام کی پاکیزگی، شگفتگی، شائستگی اور ندرت خیال کا بخوبی اندازہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوجاتا ہے۔ مثلاً ان اشعار پہ دھیان دیجیے:

مری آنکھوں میں بس اتنا اثر دے
نظر بس تو ہی آئے وہ نظر دے
تجھے میں اپنے سینے میں بسالوں
مجھے وہ وسعت قلب و جگر دے

....

با وضو قبلہ رو ہوکر لکھنا
نعت لکھنا تو برا بر لکھنا
ان کے اوصاف نہیں چند سطور
ان کے اوصاف کا دفتر لکھنا

....

ہوگئی اپنوں کی ظاہر دشمنی اچھا ہوا
چھوڑ دی ہم نے بھی ان کی دوستی اچھا ہوا
اس طرح سے لاج رکھ لی ہم نے اصغر پیار کی
روتے روتے آگئی لب پر ہنسی اچھا ہوا

....

اک نگاہ نفرت کی دل کو توڑ دیتی ہے
پیار سے جو ٹکراو حادثے نہیں ہوتے

....

دوستی کا جو حق ادا نہ کرے
ان سے ہو دوستی خدا نہ کرے

....

بیٹھنا ہے تو گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھو
یہ تو دیوار کا سایا ہے چلا جاے گا
سوچ کے آیا تھا دنیا میں سب اپنے ہونگے
اپنا سایا بھی پرایا ہے چلا جاے گا

....

چھپاوں آئینے سے کیا حقیقت
بڑا کمبخت ہے سچ بولتا ہے

....

ہر لفظ کو سمجھا ہے تبھی حفظ کیا ہے
قرآن کی آیات کو رٹ کر نہیں دیکھا

....

کوئی پہلے تو کوئی بعد اصغر
سب کو جانا ہے سب کی باری ہے

....

جانے کس بات سے بدظن ہیں زمانے والے
ہم ہیں دشمن کو بھی سینے سے لگانے والے

....

سینے میں مرے کس کے یہ قدموں کی صدا ہے
یہ کون ہے سانسوں میں مری بول رہا ہے

....

درج بالا اشعار میں سوز و گداز، درد و کسک اور زمینی حقائق پہ شاعر کا مخصوص نقطۂ نظر قاری کو دور اور دیر تک سوچنے پہ آمادہ کرتا ہے۔ دنیا کی ناپائداری، خالق کائنات کی صناعی اور فطری صداقتوں کے بیان میں شاعر کا تہہ دار شاعرانہ تخیل نئی منزلوں کا پتا دیتا ہے۔ اصغر ویلوری نے نہ صرف زبان اور محاورہ کی سادگی و پرکاری کا خیال رکھا ہے بلکہ انسانی رشتوں، انسانی نفسیات اور اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل کا بھی انھیں گہرا ادراک ہے۔ اس سلسلے میں وہ شعری اظہار پر قادر نظر آتے ہیں۔

رباعی کے بارے میں تقریباً تمام اہل سخن کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ رباعی شاعری کی بہت مشکل صنف ہے اسکے تقاضوں سے وہی سخنور عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جنھوں نے حیات و کائنات کو بہت قریب سے دیکھا، سمجھا ہو اور اسکے عطا کردہ دکھ سکھ کو بھوگا بھی ہو اور اس سے متعلق ایک حکیمانہ نقطۂ نظر بھی رکھتے ہوں۔ اصغر ویلوری ایک منفرد رباعی گو شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے انفراد اور کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف رباعی کے فنی تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں بلکہ انھوں نے زندگی کے مختلف تجربات و احساسات کو رباعی میں اس قدر سمویا ہے کہ زندگی کی بہت ساری حقیقتیں اپنی پوری اہمیت و معنویت کے ساتھ اجاگر ہوگئی ہیں۔ میرے خیال میں یہ ہوشربا کام ایک ایسا شاعر انجام دے سکتا ہے جو اپنی شعری روایات سے واقف ہو اور اصل صورت حال پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ اصغر ویلوری کی رباعیات ہمارے شعری ذوق وجدان کی تسکین کا باعث بنتی ہیں۔ میرے اس بیان کی توثیق کے لیے چندر بھان خیال کی رائے ملاحظہ کیجیے۔ وہ اصغر ویلوری کے بارے میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> ''اصغر ویلوری ایسے فنکار ہیں جنھوں نے زندگی کو نہ صرف جیا ہے بلکہ اسے بخوبی جانا اور سمجھا بھی ہے۔ اسی سمجھ نے رباعیات کی شکل میں ایسے گوہر پارے دیے ہیں کہ پڑھنے والا چونک اٹھتا ہے''

(منتخب رباعیات اصغر۔ص 7)

چندر بھان خیالؔ نے اصغر ویلوری کی رباعیات کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے

مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ واقعی موصوف کی رباعیات قاری کو چونکانے، سوچنے اور دل وجگر کو تھامنے پر مجبور کرتی ہیں۔ فکر کی گہرائی اور صداقتوں کی قاری ضرب سے کئی شعری پیکر ذہن پہ ابھرتے چلے جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو بذات خود ان کی رباعیات پڑھتے چلے جائیے۔ یہاں نمونے کے طور پر اصغر ویلوری کی چند رباعیات درج کی جاتی ہیں ملاحظہ فرمائیے:

ہر موج میں پنہاں ہے روانی تیری
چڑیوں کی چہک میں ہے کہانی تیری
ہر شے تری یکتائی کی دیتی ہے دلیل
ملتی ہے ہر اک شے میں نشانی تیری

....

تو نیل میں رستہ بھی بنا دیتا ہے
تو آگ کو پھولوں سے سجا دیتا ہے
بندے جو ترے شکر میں ہیں سربسجود
تو نعمتیں سب ان پہ لٹا دیتا ہے

....

تو نے کہا کن ہوگئی دنیا روشن
سنگلاخ زمین بن گئی ساری گلشن
اک تیرے اشارے سے فنا ہے سب کو
اک تیرا ہی رہ جائے گا باقی مسکن

....

مجھ کو نہ کوئی مال نہ زر دے مولا
رحمت سے تو جھولی مری بھر دے مولا
لکھوں تیری تا عمر یوں ہی حمد وثنا
تو میرے قلم میں وہ اثر دے مولا

....

بھارت کی بلندی کا نشان ہے اردو
اس دیس میں صدیوں سے جوان ہے اردو
مدراس سے کشمیر تلک اس کی ضیا
اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہاں ہے اردو

....

عیسائی مسلمان نہ ہندو ہوں میں
سانسوں میں جو بس جائے وہ خوشبو ہوں میں
شائد ابھی سمجھا نہیں تم نے مجھ کو
میں کوئی پہیلی نہیں اردو ہوں میں

....

روشن نہیں کرتے ہیں جلا دیتے ہیں
اے شمع تجھے لوگ سزا دیتے ہیں
دیتے ہیں یہی تیری وفاوں کا صلہ
آتے ہی سحر تجھ کو بجھا دیتے ہیں

....

دیکھے ہیں بہت پیار جتانے والے
جب وقت پڑے آنکھ چرانے والے
اصغر ہمیں اب بات سمجھ میں آئی
سب دوست نہیں ہاتھ ملانے والے

....

مشکل میں ہے ایمان بڑی مشکل ہے
اب کیسے بچے جان بڑی مشکل ہے
چہروں پہ لگا لیتے ہیں نقلی چہرے
اب دوست کی پہچان بڑی مشکل ہے

اسلام کی ہے امن پر قائم بنیاد
لڑنا ہے اگر خود سے بھی کرنا ہے جہاد
اس لفظ کے معنی کو غلط سمجھا کر
جو امن کے دشمن ہیں مچاتے ہیں فساد

....

فطرت ہے یہی اپنی سلیقہ اپنا
ہر ایک سے ہے پیار بھی گہرا اپنا
چہروں کو فقط دیکھ کے اصغر ہم نے
بدلا نہیں ہرگز کبھی لہجہ اپنا

....

سب کے لیے ایک سا ہے منشا میرا
بدلا نہ کبھی پیار کا لہجہ میرا
ہر ایک کو میں بانٹتا پھرتا ہوں خلوص
میں نے کبھی دیکھا نہیں تیرا میرا

....

جس گھر میں ہے اس گھر کی ہے زینت عورت
اس گھر کو بنا دیتی ہے جنت عورت
کٹیا کی بھی بڑھ جاتی ہے رونق اس سے
ہنستے ہوئے سہہ لیتی ہے غربت عورت

....

بستر ترا مٹی تو ترا گھر مٹی
ڈالیں گے ترے دوست ہی تجھ پر مٹی
دنیا میں کسی کا نہیں ہوتا کوئی
مٹی ہی سے مل جاتی ہے جا کر مٹی

اصغر ویلوری کی ان رباعیات میں دل کو چھو جانے والا سر تال موجود ہے۔ شعری پیرائے میں ان کا مبلغانہ انداز جہاں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ نظام عالم کے پس پردہ خالق کل کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں تو وہیں دیگر مندرجہ رباعیات اپنی موضوعاتی بوقلمونی کے ساتھ قاری کو نفسیاتی، معاشرتی، نسائی، لسانی اور دنیا کی بے ثباتی پہ غور وتدبر کی دعوت دیتی ہیں۔ تمام اشعار دردل پہ دستک سی دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان اشعار سے شاعر کا خلوص، اس کی متانت اور پوری انسانیت کے لیے اسکی دردمندی کا پتا چلتا ہے۔

اصغر ویلوری کی شاعری حزن ویاس اور تزکیۂ نفس کی شاعری ہے۔ غم واندوہ کے تند وتیز جھونکوں کو سہنے کے باوجود انھوں نے اپنے نفسانی اور انسانی وجود کا توازن برقرار رکھا ہے۔ میں آخر پر اصغر ویلوری کی شاعری کے بارے میں یہ لکھے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا کہ عصری معاشرے میں رائج الوقت جتنی بھی ذہنی خباثتیں اور بداعمالیاں ایک نیک، امن پسند اور شریف النفس آدمی کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہیں، اصغر ویلوری کی شاعری ان تمام خباثتوں کے خلاف ایک طرح کا احتجاجیہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے پاس خوبصورت شعری زبان، فکر کی بلندی، تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال، حسن معانی اور اصلاحی رنگ وآہنگ ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ دراصل آج کے مادیت پرست سماج ومعاشرے کو اصغر ویلوری کی اصلاحی وآفاقی شاعری راہ راست پر لے آسکتی ہے۔

....

شاہباز راجوروی کا ''اعراف'' گناہ وثواب کا اعتراف

لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے جب کوئی آدمی خاصا مشاق اور تجربہ کار ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہ تو عام قاری رہتا ہے اور نہ عام لکھاری۔ علمی وادبی دنیا بڑی عجیب وغریب دنیا ہوتی ہے۔ یہاں اگرچہ زندگی کی صداقتیں نہیں بدلتیں لیکن طرز تکلم اور اظہار وابلاغ کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ کثیر مطالعہ، گہرا مشاہدہ، دلچسپ اور موزوں لسانی برتاو ایسے ہتھکنڈے ہیں جن کی وساطت سے ایک ادیب وشاعر خود بینی وجہاں بینی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ میں اکثر اس بات پہ مصر رہا ہوں کہ ادب کے نام پہ جب کوئی فن پارہ یا ادب پارہ وجود میں آئے تو اس میں ادبی مقتضیات کا خیال رکھتے ہوئے ادبیت وشعریت کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔ مانا کہ کوئی بھی ادب پارہ صحیفہ نہیں ہوتا۔ انسان بشر ہے اور بشریت اس کی سرشت میں ہے، اس لیے معائب ومحاسن کا پایا جانا کوئی غیر فطری بات نہیں۔ ایک بڑے ادیب وشاعر میں جب کثیر مطالعہ، گہرا مشاہدہ اور علمی وادبی ذوق وشوق پوری ذہنی ورزش کے ساتھ بالیدگی کے عروج کو پہنچتا ہے تو اس کا ادبی وشعری کارنامہ عہد ساز اور تاریخ ساز کہلائے جانے کے لائق بنتا ہے۔ بلاشبہ ادبی سروکار میں لفظ ومعانی کا کھیل بغیر محنت ولگن اور ذہنی وقلبی میلان کے کھیلنا ناممکن ہے۔ شعروادب کو سماج کا آئینہ دار بھی کہا جاتا رہا ہے۔ اس بات میں مبالغہ آرائی کا کوئی بھی شائبہ نہیں۔ ہر شاعروادیب اپنے شعری وادبی وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے سماج ومعاشرے یا داخلی وخارجی زندگی کے حالات وکیفیات کو ادبی وشعری آہنگ میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس پیشکش میں کون کتنا کامیاب ہوتا ہے اس کا ثبوت وفیصلہ

شعری وادبی متون کے تناظر میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

شاہباز راجوروی کو جموں و کشمیر کے شعری افق پہ طلوع ہوئے ایک طویل مدت ہو چکی ہے۔ انھوں نے اپنی علمی، ادبی و شعری کاوشوں سے نہ صرف اپنے خطہ پیر پنچال کا نام روشن کیا ہے بلکہ ریاست جموں و کشمیر کے چند نمائندہ شعرا کی کہکشاں میں ان کا شعری قد اپنے شعری وقار سے خاصا تابندہ اور نمایاں ہے۔ شاہباز راجوروی کے حوالے سے یہ بات ہم اردو والوں کے لیے باعث افتخار بھی ہے اور باعث حیرت بھی کہ وہ اردو، انگریزی، فارسی، کشمیری، پہاڑی اور گوجری زبانیں نہ صرف جانتے ہیں بلکہ ان میں خاص کر اردو، کشمیری، پہاڑی اور گوجری میں ان کی ادبی تخلیقات ان کی ہمہ جہت لسانی شعور وادراک کا ایک ٹھوس ثبوت بھی ہیں۔ اردو میں ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''انداز نظر'' دو شعری مجموعے ''لمحے لمحے'' اور ''اعراف'' کشمیری میں ان کے چھ شعری مجموعے، پہاڑی میں ایک شعری مجموعہ اور گوجری میں اگر چہ کوئی مجموعہ نہیں چھپا ہے لیکن گوجری میں بھی ان کی نظمیں، غزلیں، منقبت، نعتیں اور متعدد مضامین اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ شاہباز راجوروی کی ذات گرامی اسم بامسمٰی ہونے کے ساتھ نہ صرف اردو کے بلکہ علاقائی زبانوں کے ایک کہنہ مشق ادیب کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔

''اعراف'' شاہباز راجوروی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ 190 صفحات پہ مشتمل یہ شعری مجموعہ زیادہ تر آزاد نظموں اور کچھ غزلوں، قطعات اور منتخب اشعار سے مُزیّن ہے۔ اس مجموعے کی شعریات بار بار اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ شاعر کے سامنے ہر روز کوئی نہ کوئی گناہ کبیرہ ہو رہا ہے اور وہ خود اخلاقی و روحانی قدروں کا نوحہ گر ہو کے رہ گیا ہے۔ سفاکیت، جبر و تشدّد، ظلم و زیادتی اور خوف و دہشت نے ایک پُر سکون اور آسودہ حال زندگی کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ ایسے پُر آشوب اور وحشتناک ماحول کو شاعر موصوف نے اپنی آزاد نظموں میں جس شعری آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ شاعر کے جذبات واحساسات اور اس کی فکری اساس سے ایک نیک انسان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ امن وسلامتی اور خیر خواہی کا متمنی ہے۔ چنانچہ اس کے ذہن و دل

میں اچھا دیکھنے، سننےاور سوچنے کے ساتھ عملی طور پر کچھ اچھا کر گزرنے کی امنگ ہے۔ مذکورہ شعری مجموعے میں شاہباز راجوروی نے اپنی پیرانا سالی کے باوجود شعری روایت کا احترام کرتے ہوئے روایت میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایاز رسول نازکی نے بھی اس صداقت کا اعتراف ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''اعراف'' میں شاہباز کی نظمیں، غزلیں اور چند قطعات شامل ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس مجموعے کی نظموں کے حصّے نے راقم الحروف کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ عالمی ادبی روایتوں میں پچھلی کئی دہائیوں سے ایک خوش کُن تغیر پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے اور اسی کی بدولت آج کے دور میں عالمی ادب شعری تصنّع اور بناوٹی لہجوں سے آزاد ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ راست اظہار کی کیفیت نے مشکل گوئی کو بے دخل کیا ہے اور خود آکر سنگھاسن پر بیٹھ گیا ہے۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے کے مصداق سیدھے سیدھے صاف صاف بات کرنے کو اولیت اور فوقیت نصیب ہوتی گئی ہے''

(مشمولہ ''اعراف''، تکبیر پبلی کیشنز گاؤکدل سرینگر 2012ء ص 9 تا 10)

شاہباز راجوروی نے اپنے سماج و معاشرے میں رونما ہو رہے جن حالات و واقعات پر جس طرح کا احساساتی ردِّعمل شاعرانہ لب و لہجے میں پیش کیا ہے وہ قابل توجہ اور چشم کُشا ہے۔ لگتا ہے انھوں نے پُر آشوب حالات کے عطا کردہ درد و کرب اور لا ینحل مسائل و معاملات میں ایک خوشگوار تبدیلی کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ حیات و کائنات کے چکر ویوہ میں ان کی اضطرابی کیفیتوں کا موثر اظہار ان کی مندرجہ ذیل آزاد نظموں کے شعری ٹکڑوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

ساکت و سامت پرندے۔ آدمی۔ ندیاں۔ حیات
گیت روٹھے۔ بالیاں ماتم زدہ۔ مدفون سارے قہقہے
کھیت لمبی خامشی اوڑھے ہوئے

مختصر دنیا ہے اب محنت کشوں کی اداس
کانپتی سانسوں میں سرگوشی ادھر
جھونپڑوں میں بجھ گئے سرِشام مٹی کے دیئے
چیختی ہیں۔ سرسراتی۔ سرخ اڑتی ''گولیاں''
سینہ دہلاتی ہے ''گولوں'' کی گرج

(نظم، تناظر)

شام کے سرمگیں سائے
اختیار نہیں۔ قہقہے۔ آنسو
کانپتے جذبات
سرد سلیں ہیں جسموں پر
یخ بستہ زمزمے سارے
بے موسمی پرندوں کے
''وقت بیزار'' گل داودی''
جاگتا ہے آنگن میں

(نظم، اجنبی دیس کے مسافر)

کیا ہے تاراج غارت گروں نے
امید آشیاں میں روز و شب تنکے چنے تھے
جہاں بس خون کی بارش سے
بھیگے ہیں شب و روز
تمہارے ہجر میں ہے خواب بنتا
کوئی دیوانہ۔ نوحہ سن سکا ہے

(نظم، نوحہ)

اجنبی شہر کی لفظیات
مرے دور کے لوگ منکر ہوئے
نیکیاں اب نہیں لازمی
فقط سیم وزر کی ہوس، بے محابا مشینی تصور
پوست و گوشت کا اک ہیولیٰ ہے یہ آدمی (نظم، سانحہ)

شاہباز راجوروی کی ان آزاد نظموں میں ایک سراسیمگی اور حزنیہ ماحول کی منظر کشی در آئی ہے۔ ان کی متعدد نظموں میں وقت اور حالات کی ستم ظریفیاں ہمیں کہیں چونکاتی ہیں اور کہیں رُلاتی ہیں۔ بہت سی نظموں میں طنز و مزاح اور اصلاحی جذبہ کار فرما ہے۔ آزاد نظموں کے علاوہ چند ایک پابند نظموں میں بھی انھوں نے اپنے سماج و معاشرے کی بھیانک صورتحال پر اور بالخصوص اس سیاسی و سماجی سسٹم پر طنز و رمز کے تیر چلائے ہیں جس معاشرے میں رقص ابلیس برابر جاری ہے اور صاحب اقتدار لوگوں پر بے حسی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں شاہباز راجوروی کی ایک نظم ''نوحۂ روز و شب'' سے ماخوذ چند بند ملاحظہ ہوں:

قتل گاہ کہیے، شہادت گاہ۔ سارے مضمرات
خوں چکاں، خوں ریز، خوں افشاں حیات
نالہ و فریاد و ماتم یا صدائے احتجاج
اذن اتنا بھی نہیں ہے کارگاہ بے حیات

....

سرکشی فرمانرا، بے سود سب علم و دلیل
بے زباں مظلومیت ہے کچھ نہیں ہے قال و قیل
وقت کے منصف گراں گوشی میں ہیں مست خمار
ترجماں کیسے بنیں اس شہر کے گونگے وکیل

....

یہ سیاست کار او رمحراب ومنبر کے امیں
اک ریا کاری ہے، رہزن لے گئے سوز ویقیں
قول مبہم کہہ کے بیچاروں کو غلطاں کر گئے
سادہ لوح، معصوم روحوں کا لُٹا دنیا و دیں

....

بے خداوں کی خدائی ہے یہاں پر الحذر
نوع انساں کی تباہی ہے یہاں پر الحذر
وقت کے ابلیس ہیں اور فتنہ زا ماحول
ایک آشوب سمائی ہے یہاں پر الحذر

....

شعری مجموعہ''اعراف'' میں شاہباز راجوروی کی دور رس نگاہوں نے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے بحرانی حالات وواقعات کومقید کیا ہے بلکہ انھوں نے اکیسویں صدی میں بدلتے عالمی منظرنامے کوبھی سوشل میڈیا کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک مخلص، خیر خواہ اور امن پسند انسان کی حیثیت سے ان تمام شرور اور شر پسند عناصر کو قابل لعنت وملامت ٹھہرایا ہے جس کے باعث اخلاقی، روحانی اور سیاسی وسماجی اقدار وروایات قصۂ پارینہ یا ذہنی پسماندگی قرار پائی ہیں۔ ان کی آزاد نظموں میں ناخوشگوار حالات وواقعات کی تلخیوں کا بیان تو ہے ہی لیکن ان کی غزلوں میں بھی ایک طرح کی اضطرابیت وسیمابیت آگئی ہے۔ دراصل انھوں نے حالات وواقعات اور زندگی کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ انھوں نے ظالموں کے ظلم اور منافقوں کی منافقت کا زہر پیا ہے۔ ریا کاروں کی ریا کاری اور اپنے پرایوں کی فریب کاری کا دکھ درد جھیلا ہے۔ یقین نہ آئے تو اس موقعے پہ شاہباز راجوروی کے مندرجہ ذیل غزلیہ اشعار پر دھیان دیجیے:

ہم ہیں آدم خور بستی کے مکیں
کون قاتل ؟کون منصف؟ کیا یقیں

آسیہ کا قتل کرتا ہے سوال
کن ضمیروں کا قلم ہوگا امیں

....

یادوں کے سب چراغ سرہانے جلا رکھے!
ظلمت کدے سے رات بھر یوں جھوجھتا رہا
بیساکھیوں پہ لوگ تھے کتنے دراز قد
آئے زمین پر تو سایہ سمٹ گیا

....

منافق لوگ ہیں چہرے بدلتے
فقیروں کو یہ حیرانی نہیں ہے

....

درد کی بستی سوچ سبیل
کون ہے منصف کون وکیل !
دہک رہی نمرود کی آگ!
مانگ خدا سے آج خلیل

....

یاد رہیں گے صدمے سارے
وقت نے کیا کیا چھین لیا تھا

....

ہمارا شہر ہے طرفہ تماشہ
اگائے بھوک، اور فتنے جگائے

....

خاموشی جُرم حق گوئی پہ پہرے
عجب افتاد میں وہ جی رہا ہے

فرشتے شہر میں بستے نہیں ہیں
مگر انسان کیوں ملتے نہیں ہیں

....

با خدا کوئی نہیں ہے، بے خدا کوئی نہیں
ایک صحرا جی رہا ہوں رہ نما کوئی نہیں

....

ہمارے شہر کے اطوار بدلے
سچائی مر رہی ہے چیختا ہوں
نئی نسلوں نے بیچے میرؔ و غالبؔ
تعاقب کر رہے ہیں بھاگتا ہوں

....

نفرتیں پالتے ہیں سینوں میں
اور سجدے دراز کرتے ہیں

....

بھیڑ میں کھو گیا لوگو
ڈھونڈنا پڑ گیا چہرہ

....

ہم سے شاہباز یہی بھول ہوئی ہے
ہم نے سمجھا کہ ہر شخص ولی ہے

....

جن کی شرافت فتنہ زا جن کا عمل فساد
ایسے فقیہہ الاماں، ایسے امام الحذر

....

''اعراف'' میں شامل بہت سی نظمیں، غزلیں اور قطعات زندگی کے فکر و فلسفے اور زماں و مکاں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ مجموعے کے شعری مشمولات کی ایک دلچسپ اور نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ شاعر نے فطری ماحول و مناظر، حالات و واقعات اور اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو دیدہ وری کے ساتھ تاریخی یادوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ شاہباز کا شعری ڈکشن دل کو موہ لینے والا ہے۔ ہر نظم، غزل اور قطعات کے آخر پہ تاریخ درج کی گئی ہے۔ لگتا ہے شاہباز راجوروی کے ذہن و دل میں یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو انھیں نہایت عزیز ہے، ان کا کلام قابل قدر اور زندگی آمیز ہے جس کی قرات سے علم و آگہی اور معنی آفرینی کی کئی تہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

....

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق

'تحقیق' کے لُغوی معنی حقیقت کی تلاش یا کھوج کے ہیں۔ یہ کائنات اور اس کی ہر شے انسان سے تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔ تحقیق کا جذبہ وہ پاک جذبہ ہے جو انسان کو نہ صرف معلومات فراہم کراتا ہے بلکہ انسان کو عقل وشعور، فکر وبصیرت اور تہذیب وشائستگی سے بھی رُوشناس کراتا ہے۔ مزید برآں یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دُنیا میں جتنی بھی عظیم اور حیرت انگیز ایجادات ہوئی ہیں یہ سب تحقیقی جذبے کا نتیجہ ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے تحقیق کا جذبہ انسان کی زندگی میں کارفرما رہا ہے کیونکہ مظاہر فطرت کی تمام پوشیدہ طاقتوں کو جاننے، اُن سے فیضیاب ہونے اور خوب سے خوب تر کی جستجو اور کرید کا جذبہ فطری طور پر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔ چناں چہ یہ وہ جبلی قوت ہے جس نے تہذیبی، تمدنی اور سائنسی سفر کو جاری رکھنے کے لیے انسان کو ہر دور میں مجبور کیا ہے۔

جہاں تک اُردو ادبی تحقیق کی عمر کا تعلق ہے وہ تقریباً دوسو برس کو محیط ہے مگر اس کے باوجود اسے جن ممتاز محققین نے انتہائی محنت ولگن اور ایماندارانہ جذبے کے تحت ٹھوس اور مستحکم بُنیادوں پر اُستوار کر کے حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا کے مصداق بنایا۔ اُن میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، الطاف حُسین حالی، محمود شیرانی، سید سُلیمان ندوی، مولوی عبدالحق اور تقسیم ہند کے بعد مسعود حُسین خان رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر حامدی کاشمیری، رشید حسن خان، مالک رام، اسلم فرخی، ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر جمیل

جالبی، مشفق خواجہ، محمود الٰہی، نُور الحسن ہاشمی، سیدہ جعفر اور وحید قریشی اُردو تحقیق میں ایسے معتبر نام ہیں جنھوں نے تحقیق کے اُصول اور طریقۂ کار مرتب کر کے اسے باضابطہ طور پر ایک سائنسی علم بنا دیا۔ ان محققین کے بعد جن لوگوں نے اُردو تحقیق میں اپنا نام و مقام پیدا کیا اُن میں نور الحسن نقوی، نذیر احمد، مختیار الدّین احمد، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عابد پیشاوری، پروفیسر عبدالستّار دلوی، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر ظہور الدّین، پروفیسر منظر اعظمی، ڈاکٹر برج پریمی، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر قدوس جاوید، عبدالغنی شیخ لداخی اور ٹی آر رینہ جیسے محققین کے اسمائے گرامی خاصی اہمیت کے حامل ہیں کہ جنھوں نے اُردو تحقیق کو نہ صرف نئی جہتوں سے آشنا کیا بلکہ اسے اعتبار و معیار اور وقار بھی بخشا۔

'تحقیق' ایک مشکل عمل ہے۔ ادبی تحقیق میں موضوع کا انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی، حوالوں کے معتبر اور غیر معتبر کی پہچان اور صحیح معلومات اخذ کرنے یا چھان پھٹک کے بعد مقالے کی تسوید ایسے دُشوار گزار مراحل ہیں جو بغیر اُصول تحقیق کی پیروی کے طے نہیں کیے جاسکتے۔ محققین کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ تحقیق بلاشُبہ ایک کٹھن، صبر آزما اور محنت و دقّت طلب کام ہے۔ بقول نارائن دت:

> ''در حقیقت ادبی و تحقیقی مقالہ لکھنا جانفشانی کا کام ہے۔ سب سے پہلے موضوع کے مطابق مقالے کا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے اور پھر اس خاکے کے مطابق مواد اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد گہرے مطالعے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پھر کہیں جا کر مقالے کو ترتیب دی جاسکتی ہے۔ یہ کام کافی محنت و لگن مانگتا ہے اور اس کام کو صرف اُردو زبان و ادب سے عشق کی حد تک محبت کرنے والے فن کار ہی انجام دے سکتے ہیں''

(''محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے لکھوائے گئے تحقیقی مقالات'' مشمولہ ''پرواز ادب'' بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ۔ شمارہ نومبر، دسمبر 199ء ص 41)

تحقیقی کام کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروہ اُن افراد کا ہے جو تحقیق جیسے ایماندارانہ اور مُنصفانہ فریضے کو انفرادی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔ عشق اور ہوس کی تفریق کو وہ بہتر جانتے ہیں۔ تحقیق اُن کے نزدیک علمی فریضے کا درجہ رکھتی ہے۔ چناں چہ اُن کے پاس علم وعمل اور کام کرنے کی لگن ہے۔ وہ شہرت اور دولت کی خاطر تحقیق نہیں کرتے مگر ایسے مخلصین کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو علمی وادبی دانش گاہوں میں اُستاد کے عہدے پر فائز ہیں۔ اُن کی دوہری ذمہ داری ہے ایک یہ کہ بذات خود بہترین تحقیقی کارنامے انجام دیں۔ دوسرے اپنی زیر نگرانی طلبہ کو منتخبہ موضوعات پر اتنی محنت کرائیں کہ ریسرچ اسکالر موضوع کے ساتھ صحیح انصاف کرسکے۔ کاتا اور لے دوڑی والا معاملہ نہ ہو۔ یہاں اس بات کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ تحقیق ایک وادئ پُر خار کی مانند ہے جس میں چلنا ہرکس وناکس کا کام نہیں ہے۔ اس لیے بھی کہ تحقیق کرنے والے میں چند بنیادی اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

پہلی صفت یہ کہ تحقیق کار سچ کو اپنا شعار بنالے۔ تحقیق کو چونکہ سچ کا کاروبار کہا گیا ہے اس لیے کسی دوسرے کی تحریر یا دریافت کو بغیر حوالے کے درج کرلینا ایک غیر محققانہ عمل ہے۔ دوسری اہم صفت یہ کہ تحقیق کار کو تحقیق سے بے حد دلچسپی اور ذوق وشوق ہو۔ ایک طرح کا ایسا ولولہ جو اُسے ہر وقت کام کرنے پر آمادہ کرتا رہے۔ اُس میں نامعلوم کو معلوم کرنے کی اُمنگ اور کرید ہو۔ بے ترتیب مواد کو اس طرح ترتیب دے سکے کہ اُس میں منطقی اور فکری ربط کے ساتھ وضاحت پیدا ہوجائے۔ تحقیق کار میں تیسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ اُس کا تجربہ وسیع اور مطالعہ گہرا ہو۔ دریائے ادب کا شناور ہو۔ اُس نے اپنے موضوع سے متعلق پہلے ہی سے کافی معلومات حاصل کرلی ہوں۔ مجموعی طور پر تحقیق کار میں حق گوئی، بے تعصّبی، بے غرضی، محنت ولگن، اخلاقی جرات، غیر مقلّد مزاجی، ادبی علوم سے گہری دلچسپی اور واقفیت کا ہونا بہت ضروری ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے اوّلیں نقوش ہمیں محمد الدّین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ فوق کی تحقیق کا اصل دائرہ تاریخ ہے مگر اُن کے کئی

تذکرے ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست ادبی تحقیق کے ساتھ ہے۔ مثلاً ''یادرفتگاں'' تذکرۂ علمائے لاہور'' تذکرۂ شعرائے لاہور'' اور تذکرۂ اخبار نویساں'' فوق کی یہ تمام تصانیف تحقیقی نوعیت کی ہیں۔

محمد عمر نور الٰہی دو ادب نواز دوستوں نے مشترکہ نام سے ''ناٹک ساگر'' جیسی معرکتہ الآرا تصنیف بطور یادگار چھوڑی ہے جو 1924ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی۔ مذکورہ کتاب ڈراما نگاری کے فن اور اس کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حقائق کی بازیافت اور واقعات کی صحت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مُصنفین نے بڑی جگر سوزی کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے۔

حبیب کیفوی نے ''کشمیر میں اُردو'' کے عنوان سے ادبی حلقوں میں بحیثیت محقق اپنی شناخت قائم کی۔ مذکورہ کتاب میں فاضل مصنف نے ''کوہستان جموں کا ایک عوامی شاعر داس علی'' ڈوگری کو دفتری زبان بنانے کی کوشش'' جموں وکشمیر میں اُردو کی ترویج و ترقی کی ابتداء'' سفر نامۂ بخارا اُردو کی پہلی تحریر'' اُردو کی ایک قدیم مثنوی'' کشمیر دربار میں دہلی کے نقیب'' کشمیر میں عیسائی مشنریوں کی آمد'' تعلیم کی ابتدا'' جموں میں محرم کی مجالسیں'' نظیر اکبر آبادی کی مقبولیت'' جموں میں ناٹک کمپنی کا قیام اور اُردو کی ترویج'' کشمیر میں ہندوستان کے سیاحوں کی آمد و رفت'' اُردو کشمیری کے مشترک الفاظ'' جموں کی تحصیل بھمبر میں فوجی دربار اور حکام کی اُردو میں تقریریں'' انگریز ریکروٹنگ افسر میجر ٹینکرڈ کی اُردو میں تقریر، ڈاکٹر دیوان بدری ناتھ ریکروٹنگ سیکریٹری کی تقریر اور مشیر مال چودھری خوشی محمد ناظر کی تقریر جیسے ذیلی عنوانات کے تحت ''کشمیر میں اُردو'' سے متعلق مواد کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تمام تاریخی اور لسانی حقائق واضح طور پر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف نے اگرچہ اس کتاب کا نام ''کشمیر میں اُردو'' رکھا ہے مگر اس میں جموں میں اُردو کی نشو نما کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔

عبدالاحد آزاد کی گراں مایہ تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' کو بھی ادبی تحقیق کے زُمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ تین جلدوں پہ مشتمل یہ ضخیم تحقیقی مقالہ اگرچہ اُن کی حیات

میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر نہیں آیا لیکن آزادی کے بعد 1959ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے اسے تین جلدوں میں شائع کیا۔ ''کشمیری زبان اور شاعری'' عبدالاحد آزاد کا ایک ایسا جامع اور قابل قدر تحقیقی کارنامہ ہے جس میں لل دید سے مہجؔور کے عہد تک تقریباً تمام معروف اور غیر معروف شعرا کا ذکر معتبر ماخذ اور حوالوں سے ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مذکورہ تحقیقی مقالہ کسی انسائکلو پیڈیا سے کم نہیں ہے۔

1947ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے میدان میں جن محققین نے اپنے تحقیقی کارناموں سے ادبی تحقیق کو وقار بخشا اُن میں گیان چند جین، ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر ظہورالدّین، محمد زماں آزردہ، پروفیسر شام لعل کالڑا، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدّین قادری زوؔر، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر مجید مضمر اور ڈاکٹر فرید پربتی کے علاوہ کچھ اور بھی نام ہیں جنھوں نے تحقیق وتنقید کے رشتے کو مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ ان تمام محققین کا تعلق جموں اور کشمیر یونی ورسٹیوں سے رہا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا شمار جموں وکشمیر کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر محقق تھے جن کی تحقیقی تصانیف کی تعداد ستّر ہے۔ اُنھوں نے محققانہ جگر کاوی سے میر تقی میؔر، اقبالؔ اور انیسؔ کے علاوہ مرثیہ، تذکرہ اور کلاسیکی شعروادب کے بے شمار دفینوں کو منظر عام پر لایا کہ جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے کئی تحقیقی کارنامے اُردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔

پروفیسر حامدی کاشمیری ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے ناول اور افسانے لکھنے کے علاوہ جدید حسّیات اور تقاضوں سے تعلق رکھنے والی شاعری میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ اگرچہ اکتشافی تنقید کے بنیاد گزار ہیں لیکن اُن کی چند کتابیں براہ راست تحقیقی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً ''جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات'' غالبؔ کے

تخلیقی سرچشمے‘‘ اور کارگہہ شیشہ گری‘‘ (میؔر کا مطالعہ) اُن کی تحقیق کے عمدہ نمونے ہیں۔
پروفیسر حامدی کاشمیری بین الاقوامی سطح کے شہرت یافتہ ادیب اور شاعر ہیں کہ جنھوں نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری 27 دسمبر 2018ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ، تہذیب وثقافت کو جس ادبی شخصیت نے اُردو کے ذریعے متعارف کرایا وہ محمد یوسف ٹینگ ہیں۔ اُنھیں اپنے مادر وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے۔ اس لیے اُن کی تحقیقی کُتب میں کشمیر اور کشمیری شعر وادب کا پورا منظر نامہ در آیا ہے۔ اُن کا مطالعہ کافی گہرا اور مشاہدہ حیران کُن ہے۔ ایک طویل عرصے تک ریاستی کلچرل اکادمی کے منتظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے کہ جہاں اُنھوں نے ’’شیرازہ‘‘ اور ’’ہمارا ادب‘‘ جیسے اُردو کے رسائل کو اپنی مدیرانہ صلاحیتوں سے وقار بخشا۔ میؔر، غالبؔ، اقبالؔ، ناصر کاظمی، منٹو اور کشمیری ادبیات کے حوالے سے رسول میرؔ، مہجورؔ، لل دیدؔ، شیخ العالم اور عبدالاحد آزادؔ وغیرہ پر اُن کے تحقیقی مضامین بصیرت افروز ہیں۔ گذشتہ برسوں کے دوران محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی مضامین کے جو مجموعے منظر عام پر آ کر قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں اُن میں ’’شناخت‘‘ جستہ جستہ‘‘ شش رنگ‘‘ اور ’’کشمیر قلم‘‘ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے شیخ نورالدّین ولی جیسے صوفی شاعر سے لے کر للہ عارفہ اور شمس فقیر پر تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ان تمام تحقیقی مضامین سے موصوف کی تحقیق سے دلچسپی اور اُن کے علمی وادبی شعور کی کارفرمائی کا پتا چلتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ ایک محقق، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ایک طویل مدت سے اُردو شعر وادب کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے کئی تحقیقی مضامین تحقیق کے مقتضیات پر پورے اُترتے ہیں۔ اُن کی جن تحقیقی نگارشات کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اُن میں ’’اقبالؔ اور تحریک آزادیٔ کشمیر‘‘ کاروان خیال‘‘ فکر خیال‘‘ خیالات‘‘ چنار رنگ اور ’’خیال قلم‘‘ شامل ہیں۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے حوالے سے آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی ایک اہم نام

ہے۔ اُن کا اہم تحقیقی مقالہ ''سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے'' ہے کہ جس میں اُنھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ منٹو کی حیات اور اُن کی علمی وادبی شخصیت اور سرگرمیوں کو تحقیق کے طریقۂ کار کے مطابق ایک عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کا مذکورہ مقالہ نہایت جامع، مستند ہونے کے ساتھ ساتھ منٹویات کے سلسلے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ برج پریمی کی کتابیں ''کشمیر کے مضامین'' جلوۂ صد رنگ'' ذوق نظر'' اور ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما'' اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اُنھیں ادبی تحقیق سے گہرا شغف تھا اور اس کے تقاضوں کو وہ بخوبی جانتے تھے۔

لداخ کے ایک معروف ادیب کہ جس کی نوک قلم سے نہ صرف تخلیقی بلکہ ایسے تحقیقی مضامین اور کتابیں عالم وجود میں آئی ہیں کہ جن کا تعلق لداخ کی تہذیب وثقافت اور تاریخ وجغرافیہ سے بھی ہے۔ اُس شریف النفس اور محنتی آدمی کا نام عبدالغنی شیخ لداخی ہے۔ اُنھوں نے ''لداخ: تہذیب وثقافت'' لداخ: محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' لداخ: آزادی کے بعد''، قلم، قلم کار اور کتاب'' اور ''اسلام اور سائنس'' جیسی تحقیقی کتابیں لکھ کر اُردو تحقیق میں اپنا ایک خاص مقام بنایا۔

صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ظہور الدّین نے تحقیق وتنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اُنھوں نے نہ صرف ذہین اسکالروں سے اپنی نگرانی میں نئے موضوعات پر بہترین تحقیقی مقالے لکھوائے بلکہ خود بھی قابل تحسین تحقیقی کام کیا ''بیسویں صدی کے اُردو ادب پر انگریزی کے ادبی رُجحانات'' صوبہ جموں میں اُردو زبان وادب کی ترقی ''جدید اُردو ڈراما'' اور ''کہانی کا ارتقا'' اپنے موضوع، مواد اور زبان وبیان کے اعتبار سے تحقیقی تصانیف ہیں۔ دلائل وشواہد کے معاملے میں پروفیسر ظہور الدّین نہایت احتیاط برتنے کے روادار ہیں۔ (پروفیسر ظہور الدّین فروری 2019ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے) کشمیر یونی ورسٹی سے سبکدوش ہوئے پروفیسر محمد زماں آزردہ کا تحقیقی مقالہ ''مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے''، تحقیقی مقالات کی بھیڑ میں ایک اہم مقالے کی

حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں اُن محققین کا بھی ذکر کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے جو اگر چہ ریاست جموں وکشمیر کے باشندے نہیں تھے مگر وہ جموں وکشمیر یونی ورسٹیوں کے شعبہ جات یا اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کشمیر میں بحیثیت پروفیسر کام کرتے رہے۔ اُن مقتدر ادبی شخصیات میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، پروفیسر شام لعل کالرا، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، محی الدّین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر آل احمد سرور، اور پروفیسر محمد حسن نے اُردو تحقیق کو جو وقار بخشا وہ یہاں کی اُردو ادبی تاریخ کے لیے باعث صد افتخار ہے۔ پروفیسر گیان چند جین جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے بانی تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اس شعبے سے وابستہ رہے۔ یہاں رہتے ہوئے اُنھوں نے جو سب سے اہم تحقیقی کام کیا ہے وہ ''تفسیر غالبؔ'' ہے یہ ایک ضخیم مقالہ ہے جس میں غالبؔ اور غالبیات سے متعلق بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ پوری معلومات درج ہیں۔ پروفیسر شام لعل کالرا عابد پیشاوری کا تحقیقی مقالہ ''انشا اللہ خان انشاؔ: حیات، شخصیت اور کارنامے'' اس لحاظ سے نہایت اہم اور مثالی مقالہ ہے کہ اس میں تحقیق کے اُصولوں کی خاص پابندی کی گئی ہے۔ عابد پیشاوری نے انشا اللہ خان انشاؔ سے متعلق بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بصیرت افروز ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف مستند ماخذ سے مواد حاصل کیا ہے بلکہ دوسرے شواہد کی روشنی میں بھی اُن کی چھان پھٹک کی ہے۔ پروفیسر منظر اعظمی نے ''اُردو میں تمثیل نگاری'' اور ''سب رس کا تنقیدی جائزہ'' جیسے تحقیقی مقالے لکھ کر اُردو تحقیق کو فروغ بخشا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہے کہ جہاں اُنھوں نے ''کشمیر میں اُردو'' جیسا تاریخ ساز تحقیقی مقالہ لکھا جسے نہایت اہتمام کے ساتھ جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ''غالبؔ کی جمالیات'' پروفیسر آل احمد سرور نے ''اقبالؔ اور تصوّف'' اور پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ نے جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں رہتے ہوئے اقبالؔ اور اقبالیات سے متعلق بہترین تحقیقی کام کیا۔ اس سلسلے میں اُن کی تحقیقی تصانیف ''اقبالؔ اور مغربی

مفکرین'' محمد اقبالؔ ایک ادبی سوانح'' اور'' نشان منزل'' ادبی تحقیق میں خاصی اہمیت وافادیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید شعبۂ اُردو کشمیر یونی ورسٹی سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ شعبے میں رہتے ہوئے جہاں اُنھوں نے اپنی نگرانی میں ''اُردو تنقید میں اقبالؔ شناسی'' داستانی روایت اوراُردو ناول'' اُردو افسانے میں حقیقت نگاری'' اُردو تنقید پر سماجی وتہذیبی اثرات'' اُردوغزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر'' اُردوافسانے کے فروغ میں سکھوں کا حصّہ'' اکبرحیدری: حیات اورکارنامے'' اور'' اُردوغزل جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک'' ایسے اہم اورغیر روایتی موضوعات ہیں کہ جن پر اُنھوں نے ذہین اورسنجیدہ اسکالروں سے تحقیقی مقالات لکھوائے تو وہیں اُنھوں نے بذات خود'' اقبالؔ کی تخلیقیت'' اور'' اقبالؔ کی جمالیات'' اور'' متن معنی اورتھیوری'' پرقابل قدرکتابیں لکھیں۔

پروفیسر بشیراحمد نحوی کا تعلق اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر سے رہا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کے بعد اگر کسی شخص کو اقبالؔ اور اقبالیات سے والہانہ عشق ہے تو وہ بشیر احمد نحوی ہیں۔ اُنھیں حافظ کلام اقبالؔ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ چھبیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''مسائل تصوف اوراقبالؔ'' کے علاوہ ''اقبال افکار واحوال'' اُن کی اہم تحقیقی کتب ہیں۔ پروفیسر نذیراحمد ملک حال ہی میں کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ تحقیق وتنقید اُن کا خاص ادبی میدان ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کی نگرانی میں اُنھوں نے ''اُردورسم الخط : ارتقا اور جائزہ'' کے عنوان سے ایک عمدہ تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ پروفیسر مجید مضمر (مرحوم) بھی کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں تھے''اُردو افسانے میں علامت نگاری'' اُن کا تحقیقی مقالہ ہے جواپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اُن تمام حقائق کی نشاندہی کی ہے جوافسانے میں علامت نگاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ مقالے کو پڑھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ محقق نے جانفشانی اورادبی ذوق کی بنیاد پرایک اچھا مقالہ لکھ ڈالا ہے۔ ڈاکٹر منصوراحمد منصور بھی شعبۂ اُردو کشمیر یونی ورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ اُن کا تحقیقی مقالہ'' اُردوافسانے میں تہذیبی عناصر''نہایت معلوماتی اوربصیرت افروز ہے۔

جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر گیان چند جین، پرفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر شام لعل کالرا، پروفیسر منظر اعظمی اور پروفیسر ظہورالدّین جیسے ذہین اور محنتی اساتذہ نے اُردو تحقیق کا جو اعتبار و معیار قائم کیا تھا وہ اُن کے بعد قائم نہیں رہ پایا۔ البتہ پروفیسر نصرت آرا چودھری (مرحومہ) پروفیسر شکھ چین سنگھ اور پروفیسر ضیاالدّین کے علاوہ ڈاکٹر ریاض احمد نے کسی حد تک تحقیق کے معیار کو برقرار رکھنے کی سعی کی ہے۔

ریاست کے علمی و ادبی اداروں سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں بھی تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے ''بازیافت'' نام کا رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا ششماہی رسالہ ''تسلسل'' پروفیسر ظہورالدّین کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اُنھوں نے بڑی کاوشوں کے بعد یہ رسالہ جاری کروایا تھا جو فی الحال زندہ ہے۔ اس میں اساتذہ اور طلبہ کے تحقیقی مضامین چھپتے ہیں۔ کشمیر یونی ورسٹی کا شعبۂ اقبالیات یعنی ''اقبال انسٹی ٹیوٹ'' نہایت فعال ہے۔ اس شعبے کی تمام ادبی و تحقیقی سرگرمیاں ہر سال ایک مجلّہ ''اقبالیات'' میں شائع ہوتی ہیں۔ جس میں اقبالؔ کے فکر و فن اور اُن کی حیات و شخصیت کے نئے پہلوؤں سے متعلق تحقیقی مضامین ہوتے ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اب تک تقریباً چالیس سے زائد طلبہ و طالبات ایم فل اور پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔

جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی جانب سے اُردو کا ایک موقر و معیاری رسالہ ''شیرازہ'' تقریباً پانچ دہائیوں سے شائع ہوتا ہے۔ شروع میں اس جریدے کی ادارت کے فرائض جناب محمد یوسف ٹینگ نے انجام دیے اور بہت کم مدت میں اُنھوں نے اسے ملک کے مقتدر رسائل کی فہرست میں شامل کرایا۔ ''شیرازہ'' میں ریاستی اور ملکی سطح کے ادیبوں کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ محمد اشرف ٹاک، سلیم سالک، سلیم ساغر اور محمد اقبال لون نے اس معیاری رسالے کا خاص خیال رکھا ہے۔ محمد اشرف ٹاک ''شیرازہ'' کے مدیر ہیں جب کہ سلیم سالک، سلیم ساغر اور محمد اقبال لون نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے

ہیں۔ حالیہ گذشتہ برسوں میں ''شیرازہ'' کے چند یادگاری شخصیات نمبر شائع کیے گئے ہیں جن میں حامدی کاشمیری نمبر، غلام رسول سنتوش نمبر، شمیم احمد شمیم نمبر، پشکر ناتھ نمبر، عمر مجید نمبر، یسٰین بیگ نمبر، محمد یوسف ٹینگ نمبر، فرید پربتی نمبر، ہمعصر شاعری نمبر اور آٹھ ضخیم جلدوں پہ مشتمل جموں، کشمیر اور لداخ (تذکروں اور سفر ناموں کی روشنی میں) شامل ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کا محکمۂ اطلاعات بھی اُردو کا ایک ماہنامہ ''تعمیر'' کے نام سے شائع کرتا ہے 1954ء میں یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت کے فرائض معروف سیاست داں، دانشور اور ادیب شمیم احمد شمیم نے انجام دئے تھے۔ اُن کے بعد جناب محمد یوسف ٹینگ اور غلام نبی بابا کے علاوہ خالد بشیر صاحب کی ادارت میں بھی ماہنامہ ''تعمیر'' شائع ہوتا رہا۔ اس سلسلے کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے۔ مثلاً مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر، اور جموں و کشمیر ادب نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان سرکاری رسائل و جرائد کے علاوہ غیر سرکاری رسائل میں ''حکیم الامت'' سہ ماہی (سری نگر) سہ ماہی ''بزم ادب'' (سرینگر) ''لفظ لفظ'' ماہنامہ (سری نگر) اور سہ ماہی ''تفہیم'' (راجوری) میں بھی تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ ''کشمیر عظمیٰ'' تعمیل ارشاد' لازوال'' اُڑان'' اور کئی کشمیر سے شائع ہونے والے اخبارات میں تحقیقی مضامین اُن کی زینت بنتے ہیں۔

خطۂ چناب سے تعلق رکھنے والے ایک ذہین، محنتی اور خالص ادبی ذوق وشوق رکھنے والے قلم کار کا نام ولی محمد بٹ المعروف اسیر کشتواڑی ہے کہ جنھوں نے نہایت محققانہ جگر کاوی سے ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت'' تصویر ضلع ڈوڈہ'' تاریخ اشاعت اسلام'' اور تاریخ اولیائے جموں وکشمیر'' اور ُذکر وفکر'' (خالص تحقیقی مقالات پہ مبنی کتاب) جیسی قابل قدر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ ان کے علاوہ اُن کی کئی اہم کتابیں زیر ترتیب ہیں جو اشاعت چاہتی ہیں۔

ٹی آر رینا جموں کے رہنے والے ہیں اُن کے پاس محققانہ ذہن ہے۔ پنڈت میلا رام وفاؔ کی حیات اور اُن کی شاعری پر اُن کا تحقیقی کام قابل تعریف ہے۔ وہ ایک اچھے محقق تو ہیں ہی اس کے ساتھ وہ اُصول تحقیق کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ انھوں نے

رشید حسن خان کے ہزاروں خطوط کو کتابی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ اُنھیں بحثیت مدّون کتابی صورت میں پیش کیا ہے جو بہت بڑا تحقیقی کام کہا جا سکتا ہے۔

ان تمام محققین کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر میں اور بھی ایسے باصلاحیت قلمکار موجود ہیں جو اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور کتابوں سے اُردو ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے ہیں۔ اُن میں خالد بشیر، پریمی رومانی (پریمی رومانی نے جہاں اپنے والد آنجہانی برج پریمی کی ادبی وراثت کو کتابی صورت میں محفوظ کروایا تو وہیں اُنھوں نے اپنی چند اہم تحقیقی کتابیں بھی شائع کروائی ہیں) پروفیسر محمد اسد اللہ وانی، امین بنجارا، نذیر آزاد، شفق سوپوری، فاروق نازکی، ایاز رسول نازکی، جوہر قدوسی، مشعل سلطان پوری، مرغوب بانہالی، منشور بانہالی، شہباز راجوروی، ڈاکٹر تسکینہ فاضل، ترنم ریاض، فدا راجوروی، عبدالسّلام بہار، کے ڈی مینی، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر عبدالرّشید خان، ڈاکٹر شفیقہ پروین، بشیر بھدرواہی، پروفیسر محجوبہ وانی، دیپک بدکی، بلراج بخشی، ڈاکٹر شمس کمال انجم، ڈاکٹر لیاقت نیر، ڈاکٹر محمد آصف ملک، ڈاکٹر طارق تمکین کشتواڑی، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی، ڈاکٹر محمد لطیف میر، ڈاکٹر دلجیت ورما، ڈاکٹر لیش پال شرما، ڈاکٹر کرن سنگھ ڈاکٹر مول راج اور ڈاکٹر مقیم انصاری کے علاوہ اور بھی کچھ نام ہو سکتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں چند نئے باصلاحیت تحقیق کاروں میں ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر عارفہ بشریٰ، ڈاکٹر ریاض توحیدی سب سے زیادہ فعال ہیں، ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، ڈاکٹر فیض قاضی آبادی، ڈاکٹر گلزار احمد، ڈاکٹر ارشاد آفاقی غلام نبی کمار، ڈاکٹر شاہ فیصل اور سبزار احمد سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں اردو تحقیق کا چراغ روشن رکھنے میں پوری محنت ولگن سے کام کریں گے۔ وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا شخص کہ جو کسی یونی ورسٹی، کالج یا کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اُس پہ ادبی تحقیق کا ایک ایسا جنون طاری ہے جو اُسے متحرک رکھے ہوئے ہے۔ ڈیڑھ درجن کے قریب اُس کی ضخیم تحقیقی کتابیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کا اعتراف ادبی حلقوں میں بغیر تعصب اور کشادہ دلی سے کیا جانا چاہیے تھا لیکن

نہیں کیا گیا ہے۔ میری مراد عرفان تُرابی سے ہے۔ اُنھوں نے غیر مسلم شعرا کے حمد یہ، نعتیہ، مناجاتیہ اور مرثیہ کلام کو ''خونیں نوا'' آہ وفغاں'' اور ''اشک خلوص'' جیسی کتابوں میں محفوظ کیا ہے۔ اس عقیدت مندانہ کام کے علاوہ بھی اُن کی ایک ضخیم کتاب اقبال اور شاہان ولایت ہند'' قابل داد و تحسین ہے۔

راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران'' کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے 2002ء میں شائع کیا۔ 452 صفحات پہ مشتمل یہ مقالہ ساڑھے چار سال کی مسلسل محنت وعرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ 780 صفحات پہ مشتمل ایک اور تحقیقی مقالہ ''اُردو ادب میں تانیثیت'' Feminism in urdu (Literature) کو بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے 2013ء میں شائع کیا۔ ان مقالات کے علاوہ ''آئینہ در آئینہ'' اعتبار و معیار'' شعور بصیرت ''ترسیل و تفہیم'' اور ''تناظر و تفکر'' جیسی تحقیقی وتنقیدی مضامین کی کتابیں ناچیز کے جذبۂ تحقیق وتنقید کو آشکار کرتی ہیں۔

بہر حال ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کی صورتحال بہت حد تک اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحقیق جیسے کٹھن، صبر آزما اور دیانتدارانہ فریضے کو تحقیقی اُصولوں کے مطابق انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تحقیق سے اُن کا فطری میلان اُنھیں حقائق کی کھوج، اہمیت اور تجربہ، معتبر حوالے وحواشی اور شہادتوں سے صحیح نتائج اخذ کرنے اور اس کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا مناسب شعور، زبان کی باریکیوں اور اُسلوب تحریر پر دسترس رکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ یہاں راقم الحروف کے اس بیان سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ جب تک یونی ورسٹیوں میں تحقیق اور بالخصوص ادبی تحقیق کے لیے محنتی، ذہین، باذوق اور باصلاحیت طالب علموں کا انتخاب نہیں کیا جائے گا تب تک ادبی تحقیق کا معیار ہرگز بلند نہ ہوگا۔ بصورت دیگر تحقیق کے نام پر ہزاروں صفحات تو سامنے آئیں گے لیکن سوائے توارد، سرقہ اور ہو بہو نقل یا سوائے اقتباسات کے مجموعوں کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

....

تنویر بھدرواہی: شخصیت اور شاعری

محمد الیاس ملک المعروف تنویر بھدرواہی اگرچہ اب اس جہان فانی میں نہیں ہیں لیکن اُن کی باتیں، یادیں اور شاعرانہ شخصیت اُن کے شریفانہ مزاج کے ساتھ ہمیں یہ احساس دلا رہی ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ میرا تو یہ ماننا ہے کہ ایک اچھا شاعر وادیب اس جہان فانی سے گزرنے کے بعد بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ زندگی ایک غیر یقینی سفر ہونے کے علاوہ قابل قدر بھی ہے۔ ایک اچھا شاعر وادیب زندگی کی صداقتوں، نزاکتوں اور کائنات کی وسعتوں پہ مکالمہ کرتا ہے۔ وہ شعروادب کو تفریح طبع نہیں سمجھتا بلکہ تعمیر حیات کا ایک موثر اور بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔ وہ شعوری طور پر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی ادبی وشعری کاوشیں انسانی اقدار وروایات کو اجاگر کرنے کا سبب بنیں تاکہ آدمیت، انسانیت کی حسیں وادی میں داخل ہوسکے۔ ادبی وشعری متون کا بنیادی تقاضہ ادبی جمالیات ہے۔ اس کے بغیر ادب، ادب نہیں رہتا۔ ادب اور زندگی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ایک اچھے شاعر وادیب سے یہ توقع بھی کی جاتی رہی ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں ایک اچھا انسان بھی ہو۔ تنویر بھدرواہی کا حلقۂ احباب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ نہایت شریف، ذہین، خوش مزاج، زندگی کے قدردان، اچھائی اور اچھے انسان کی تلاش میں رہتے تھے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ دراصل آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، اسے انسان بننے کے لیے کافی وقت لگتا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں آدمی سے انسان بننا۔ پورے نظام عالم پہ نظر دوڑائیے، غوروفکر سے کام لیجئے اور پھر مقصد حیات کو

تلاشنے لگ جایئے تو آخر کار اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ دنیا ایک خود کار مشین کی طرح نہیں ہے بلکہ اسکے پس پردہ اللہ تعالےٰ کی ذات کار فرما ہے۔ جو اس پورے نظام عالم کو چلا رہی ہے۔ایک اچھا انسان شر کے بدلے خیر، جھوٹ کے بدلے سچ اور حرام کے بدلے حلال کو اہمیت دیتا ہے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ تمام مذاہب، دھرم، علوم وفنون، فکر وفلسفے، اخلاقی وروحانی تعلیمات آدمی کوانسان بنانے کی کوشش میں ہیں۔ کسی بھی شخص کی پروقار شخصیت سازی میں تین عناصر کا خصوصی عمل دخل ہوتا ہے۔ دالدین کی بہترین تربیت، مرشد کامل کی صحبت اور اچھا ماحول۔تنویرؔ بھدرواہی کو یہ تینوں عناصر میسر ہوئے تھے۔ دراصل انسان دنیا سے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاتا سوائے اچھائی اور برائی کے۔ میر انیسؔ نے کیا خوب کہا ہے:

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

....

تنویرؔ بھدرواہی کو اللہ تعالےٰ نے شعروشاعری کا ذوق وشوق ودیعت فرمایا تھا۔ کسی بھی طرح کا ذوق وشوق انسان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ اپنے شوق کی تکمیل چاہتا ہے۔ جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ محنت، لگن اور کوشش پیہم ایسا جذبہ ہے جو انسان کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔تنویر بھدرواہی کی ذہنی نشوونما جس خاندان اور ماحول میں ہوئی تھی، وہ بہت حد تک اللہ والوں کا ماحول تھا۔ان کے کانوں نے بچپن ہی سے جامع مسجد بھدرواہ اور مضافاتی مساجد سے پانچ وقتہ نمازوں کے لیے اذانیں سنی تھیں اور گھر کے بزرگوں کو انھوں نے تلاوت کلام پاک اور ذکر الٰہی میں رطب اللسان دیکھا تھا۔ظاہر ہے جس شخص کو دینی، اخلاقی، روحانی اور ادبی اقدار کے ساتھ پرورش پانے کی سعادت نصیب ہوئی ہو، اسکے ادبی وشعری افکار ونظریات یقیناً بصیرت افروز ہونگے۔

تنویر بھدرواہی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''پرتو تنویر'' 1994ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ ''منظر منظر آئینہ'' کے نام سے 2009ء میں منظر عام پر آیا۔ شاعر موصوف کے یہ دونوں مجموعے غزلوں اور پابند نظموں پہ مشتمل ہیں۔ مذکورہ مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد چند اہم اور مستحسن باتیں سامنے آئیں۔ پہلی بات یہ کہ تنویر بھدرواہی نے کلاسیکی اردو شاعری سے اپنا ذہنی وجذباتی رشتہ قائم رکھا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی شاعری میں شراب، شباب، کباب اور رباب کا ذکر نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ ان کی شاعری میں متصوفانہ جذبات واحساسات در آئے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ پند ونصائح اور ضرب الامثال سے تعلق رکھتا ہے۔ پانچویں بات یہ کہ موضوعاتی اور فنی اعتبار سے ان کی شاعری ایک پختہ اور سنجیدہ ذہن کی غماز معلوم ہوتی ہے۔ چھٹی بات یہ کہ ان کی بہت سی نظمیں جموں وکشمیر کے بحرانی اور تشویشناک حالات وواقعات اور اہم شخصیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ آخری بات یہ کہ ان کی شاعری میں ابہامیت نام کی کوئی بھی چیز نظر نہیں آتی۔ وہ کلاسیکی قدروں کے پرستار تھے۔ اس بات کا اعترف جموں وکشمیر کے ایک بڑے شاعر آنجہانی پنڈت کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''انقلابی شاعروں کی طرح ان کی شاعری نعروں اور للکاروں کی شاعری نہیں ہے۔ ان کے کلام میں نیا رنگ وآہنگ تو نہ ملے گا کیونکہ نہ تو وہ تہذیب نو کی حشر آفریں اداؤں کے مارے ہوئے ہیں اور نہ ہی وہ نئی تجرباتی شاعری کے حامی ہیں۔ وہ جدیدیت کے ہرگز قائل نہیں اور صرف کلاسیکی قدروں کے پرستار ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گرد وپیش کے ماحول سے آنکھیں موندے ہوئے ہیں اور ان کا دردمند دل انسانیت کے غم سے معمور نہیں''

(مشمولہ۔ 'پرتو تنویر' از محمد الیاس ملک تنویر۔ فائن پریس الیکٹرانک پرنٹرز دہلی، 1994ء ص 10)

تنویر بھدرواہی کی شاعری کے دونوں مجموعے 'پرتو تنویر' اور 'منظر منظر آئینہ' میری نظروں کے سامنے ہیں۔ اس لیے یہاں یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مجموعوں میں

شامل شاعری کے حوالے سے تنویر بھدرواہی کے افکار ونظریات اور تجربات ومشاہدات زندگی کی افہام وتفہیم کی جائے۔

'پرتو تنویر' 174 صفحات پہ مشتمل ہے۔ موصوف نے اللہ کے بابرکت نام سے اپنے کلام کی شروعات دعا سے کی ہے۔ مذکورہ مجموعے میں حمد ونعت، غزلیں، نظمیں، قطعات اور منقبت درج ہیں جو صاحب کلام کی ہمہ جہت سخنوری پہ دال ہیں۔ انھوں نے زندگی کے بنیادی مسائل ومعاملات پہ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ سماج ومعاشرے میں پھیلی گمراہی اور زبوں حالی کا بھی نوٹس لیا ہے اور بڑے پر اثر انداز میں لیا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک چونکہ ایک موثر میڈیم تھا اپنے جذبات ومشاہدات کی ترسیل کا، چناں چہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں ان کا اصلاحی نقطۂ نظر شامل رہا ہے۔ مثلاً ان کے کچھ شعری نمونے ملاحظہ ہوں:

کتنے موسم آئے، بیتے، پھول کھلے، مرجھا بھی گئے
مدت گزری لیکن دل کا زخم ابھی تک تازہ ہے
حق کے داعی، حق کے راہی کب یہ پروا کرتے ہیں
کس نے ان کی ہنسی اڑائی، کس نے کسا آوازہ ہے
اپنے ہی اک گھر آنگن کا رونا اے تنویرؔ نہیں
آج تو دنیا بھر کا بکھرا بکھرا سا شیرازہ ہے

....

کسے کہوں یہاں کیا کیا چلن نظر آئے
جوراہ بر تھے وہی راہ زن نظر آئے

....

متاع عزم وعمل گنوا کے بس اتنا حاصل کیا ہے میں نے
زباں پہ تالے لگا لیے ہیں، لب تمنا سیا ہے میں نے
خدا ہی بخشے نہ جانے کتنے بتوں کو سجدہ کیا ہے میں نے

نہ جانے کتنے بتوں کو اب تک خدا کا رتبہ دیا ہے میں نے

....

اٹھے ہیں کوہ و دمن کے جھگڑے، چمن کے سرو سمن کے جھگڑے
قدم قدم پہ وطن کے جھگڑے چراغ نفرت جلا رہے ہیں

....

دنیائے بے ثبات میں ہر منظر حیات
کتنا ہی پرکشش ہو مگر جاوداں نہیں

....

آؤ گائیں گیت ملن کے
ہنس ہنس کاٹیں دن جیون کے
نین کٹورے مدھ کے پیالے
کھلے دریچے ہیں جوبن کے
کوئی نہ دیکھا پریم پجاری
سب دیکھے متوالے دھن کے
ٹوٹے ٹوٹے خواب ہمارے
بکھرے تارے نیل گگن کے

....

امن کا خرمن جل جاتا ہے
بغض و انا کے انگاروں سے
حاسد، مفسد، جاہل، کاہل
نفرت ہو تو ان چاروں سے

....

اس دور میں عیاری صد رنگ کا غازہ

تہذیب نے انسان کے چہرے پہ ملا ہے

....

مجھے واسطہ نہیں دیر سے میں حرم میں جاوں تو کس لیے
میرے دل کے کعبے میں دیکھ لے کوئی اور اس کے سوا نہیں
میرے سوزِ غم کا ہے یہ اثر، تجھے دیکھ لیتی ہے چشم تر
تو ہزار پردوں میں ہو مگر تو مری نظر سے چھپا نہیں

....

مندرجہ بالا اشعار میں تنویرؔ بھدرواہی کی سوچ ،فکر و خیال اور داخلی و خارجی دنیا کی کئی پرچھائیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ان اشعار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سماج اور زندگی کے تئیں ان کا تجربہ و مشاہدہ کافی گہرا ہے۔یہ تمام اشعار جہاں موضوعاتی تنوّع کے حامل ہیں تو وہیں یہ اشعار پیغام صداقت اور بیان کی ندرت کے ساتھ ایک سنجیدہ قاری کو شعری حظ فراہم کرتے ہیں۔شاعر نے وقت اور حالات کی ستم ظریفیوں ہی کا نوحہ نہیں لکھا ہے بلکہ معاشرے میں پنپ رہی ان تمام ذہنی خباثتوں پہ بھی تشویش کا اظہار کیا ہے جن کے باعث ایک پرامن اور صحت مند معاشرہ مفلوج ہو کے رہ جاتا ہے۔ہندی کے الفاظ مثلاً ملن، جیون، نین کٹورے، مدھ جوبن، پریم پجاری، متوالے دھن، نیل گگن، کے استعمال سے شعریت دوبالا ہوگئی ہے اور مندرجہ آخری اشعار میں شاعر دیر و حرم کے جھگڑے سے پرے رہ کر اس بات پہ مصر نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی حکمت وقدرت کے ساتھ ذرے ذرے میں موجود ہے۔اس وحدہ لا شریک کو دیر و حرم تک محدود سمجھنا ضعف ایمان میں شامل ہے۔

تنویرؔ بھدرواہی کا دوسرا شعری مجموعہ ''منظر منظر آئینہ'' حیات و کائنات کے کئی منظر دکھاتا ہے۔149 صفحات پہ مشتمل یہ مجموعہ موضوعاتی اور فنی اعتبار سے دعوت مطالعہ دیتا ہے۔اس مجموعے میں بھی ہمیں شاعر زندگی کی الجھنوں اور گوناگوں مسائل و معاملات پہ گفتگو کرتا معلوم ہوتا ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس شعری مجموعے میں شامل شعری تخلیقات کا دورانیہ جموں و کشمیر کے بحرانی حالات سے متعلق ہے تو درست ہوگا۔کیونکہ تنویر

بھدرواہی کے سسکتے ہوئے جذبات واحساسات، ان کے داخلی درد وکرب اور احساس محرومی کی شدت اس مجموعے میں تیز تر نظر آتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں اور حالات کے جبر نے شاعر کو جہاں گوشۂ تنہائی میں شب وروز گزارنے پر مجبور کیا ہے تو وہیں وہ ایک جہان نو کی تعمیر وتشکیل کا بھی متمنی نظر آتا ہے۔ بقول پروفیسر ظہورالدّین:

''موضوعاتی اعتبار سے 'منظر منظر آئینہ' پر نظر ڈالیے تو تنویر جہاں زندگی کی ٹھوس فکری وجذباتی سچائیوں کو اظہار کی ندرت سے آشنا کرتے ہیں وہاں وہ گذشتہ بیس تیس برس کی اس زندگی کو بھی شعری صداقتوں کا پیرہن عطا کرتے چلے جاتے ہیں جن کے وہ خود عینی شاہد ہیں۔ اسی لیے اس مجموعے میں جہاں اُن پر بیتے ہوئے کربناک لمحے جابجا آہ وبکاہ کرتے ملتے ہیں وہاں وہ خوں آشام صورت حال بھی آئینہ ہوتی چلی جاتی ہے جس نے وادی کشمیر کی پرسکون زندگی کو درہم برہم کرکے زندگی کو اجیرن بنادیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ صورت حال کوئی بھی ہو اسے ایسا موثر لسانی پیرہن عطا کرتے ہیں کہ قاری خیال کی روانی اور بیان کی ندرت میں دم بھر کے لیے خود کو کھو دیتا ہے۔ لیکن یہ کھونا بصیرت کے نئے در وا کرتا ہے، قاری کو غافل نہیں کرتا''

('منظر منظر آئینہ' پر ایک نظر۔ مشمولہ، منظر منظر آئینہ۔ از محمد الیاس ملک تنویر، 2009ء ص 13)

تنویر بھدرواہی نے اپنے کلام میں زندگی کی دائمی سچائیوں کو بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے دنیا کی اُن عارضی حقیقتوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے جنھیں آج کا انسان بہت زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ مانا کہ سائنسی ترقی نے انسان کو بہت ساری آسائشیں فراہم کی ہیں لیکن قدرت کی عطا کردہ بہت سی نعمتیں سائنس نے اس سے چھین لی ہیں۔ سماج ومعاشرے سے اخلاق وکردار اور تہذیب وشائستگی کا رخصت ہوجانا کسی بڑے سانحہ سے کم نہیں۔ تنویر بھدرواہی کو اس کا احساس اُن کی روح کی گہرائیوں میں

اتر گیا تھا۔ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار میں یہ احساس موجود ہے۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

عجب بے حسی شہر والوں میں دیکھی
کوئی مر بھی جائے تو کم دیکھتے ہیں

....

حال سن سن کے مرا آپ سمجھتے ہی نہیں
میں تو چہروں کو بھی پڑھتا ہوں کتابوں کی طرح

....

یہی دور حاضر کی نیرنگیاں ہیں
ہر اک چیز مہنگی ہے، سستا لہو ہے
مجھے کیوں ڈراتی ہیں مخدوش راہیں
ابھی دل ہے زندہ، رگوں میں لہو ہے
نرالہ یہ دستور دیکھا جہاں کا
جو اچھا ہے، دنیا اسی کی عدو ہے
مرے شعر تنویرؔ مبہم نہیں ہیں
تکلف سے عاری مری گفتگو ہے

....

نام ہوتا ہے لازوال اُن کا
کام جو بے مثال کرتے ہیں
راہ حق میں منافق وفاسق
کب فداجان ومال کرتے ہیں
بے عمل، بے شعور لوگ یہاں

اہتمام زوال کرتے ہیں

....

میں وفا کر کے بھی رہا نادم
وہ جفا کر کے بھی نہ شرمایا

....

خلد سی وادی میں ہے پر ہول جنگل کا سماں
گھر کے بام ودر سے بھی اب خوف لگتا ہے یہاں
کھا گئی کس کی نظر تنویرؔ اس کشمیر کو
غم میں ڈوبی یہ ہوا بھی لے رہی ہے سسکیاں

تنویرؔ بھدرواہی کا کلام جہاں موضوعاتی اعتبار سے بوقلمونی کا حامل ہے تو وہیں ہیئتی اعتبار سے بھی خوب ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم کے فنی لوازمات کا خیال رکھا ہے اور ان کے برتاو میں احتیاط اور سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ اور لسانی کینڈا ہمیں خاص طور سے متاثر کرتا ہے۔ شفافیت، فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ قاری وسامع کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

شعر ایسے ہوں سب کہیں تنویرؔ
کیا لطافت ہے کیا فصاحت ہے
میرے شعر تنویرؔ مبہم نہیں ہیں
تکلف سے عاری مری گفتگو ہے

....

اُردو میں تانیثی تنقید

ایک نئی ادبی اصطلاح ''مابعد جدیدیت'' جہاں ذہنی وسعت وکشادگی کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی تکثیریت اور کثیرالجہات ادبی نظریات پر ڈسکورس کی راہیں ہموار کرتی ہے تو وہیں کسی ایک سکہ بند ادبی تحریک کا اسیر بننے کو مستحسن نہیں سمجھتی۔ دراصل تہذیبی، ثقافتی، سائنسی اور سماجی تغیر پذیری کے تیز رفتار عمل نے علمی وادبی دُنیا میں بھی نئی جہات مرتب کی ہیں۔ 'تانیثیت' کو بھی اسی زُمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس سے قبل کہ اُردو میں تانیثی تنقید پر براہ راست خامہ فرسائی کی جائے احتیاطاً تانیثیت جیسی نئی ادبی اصطلاح کی تفہیم اس کے تاریخی وسماجی سیاق کے حوالے سے کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

''تانیثیت'' ایک مابعد جدید اصطلاح ہے جس کی صراحت میں کئی پیچیدگیاں اور اُلجھنیں حائل ہیں۔ اس لحاظ سے اس کی ایک جامع تعریف ممکن نہیں۔ البتہ مغربی ممالک میں تانیثی ادب کو تحقیقی وتنقیدی تناظر میں دیکھا جاچکا ہے اور اس کے روشن امکانات واضح ہورہے ہیں۔ یہاں تانیثیت کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نہ صرف عورتوں کے جذبات واحساسات، مشاہدات وتجربات اور رُجحانات سے ہے بلکہ اُن خواتین رہنماؤں کی صدائے احتجاج سے ہے جنھوں نے مردوں کی بالا دستی، اُن کے ڈھائے ہوئے عورتوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کے علاوہ اپنی محکومیت کے خلاف آواز بلند کی، جس میں عورتوں کے حقوق، بچّوں کی پرورش کے حقوق، جائیداد میں معقول حصہ، طلاق کے

مسائل کی وضاحت، مختلف تعلیمی شعبوں میں عورتوں کے حقوق اور اُن کی شمولیت، مردوں کے برابر اُجرت کا تقاضا اور ووٹ کا حق جیسے مطالبات شامل تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا یہ بیان قابل توجہ ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۶۰ء یا اس کے آس پاس Feminism کی گفتگو باضابطہ طور پر سامنے آنے لگی۔ حالانکہ ایسا عمل کچھ اور انداز سے ایک صدی پہلے شروع ہوا اور کئی ایسی خواتین اور بعض مرد کم از کم مغرب میں اس پر مائل ہوئے کہ وہ عورتوں کی اس تذلیل کو نہ صرف بدلنے کی کوشش کریں گے بلکہ عالمی سطح پر چند امور کو فلسفیانہ طور پر اُبھار کر اُن کے تیئں اور اُن کے مفاد میں ضروری امور سرانجام دیں گے۔ گویا اس تحریک کے علمبرداروں نے مرد کے غلبہ والے سماج کی تبدیلی پر شدت سے زور دیا اور سماج کی تشکیلِ نو کے لئے تعلیمی حکمت عملی اور لائحہ عمل کو اپنانے کا مطالبہ کیا''1

تانیثی تنقید کے حوالے سے شیلا ربوتھم Sheilar Robotahm کی کتاب ''Hidden from History'' (1973ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس میں مصنفہ نے بڑی بے باکی سے مردوں کے اُس ظلم وستم کا بھی احاطہ کیا ہے جو تین صدیوں تک عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا اور جو مختلف روپ دھارن کر کے آج بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایلن موئرس Elen Moers کی کتاب ''Literary women'' 1976ء) ایلن شوالٹر کی '' A Literature of virgin '' (1977ء) میری جیکوبس Mary Jacobs کی women writing and writing about women(1979ء) اور جولیا کراسٹیوا julia kristava کی تنقیدی کتاب Gyno critiicism یعنی خواتین کا تنقیدی نظریہ جیسی کتابوں نے تانیثی تنقید سے نہ صرف آشنا کیا بلکہ اسے استحکام بھی بخشا۔ جولیا کراسٹیوا کی کتاب Gyno criticism اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مصنفہ نے تنقیدی اُصول ونظریات کو خواتین لکھاریوں کی تخلیقات کے تناظر

میں وضع کیا ہے۔ مذکورہ کتاب ایک ایسا منظّم تجزیاتی طریقہ کار پیش کرتی ہے جس کے تحت عورتوں کے جنسی، نفسیاتی، سماجی، اقتصادی، ازدواجی اور خاندانی مسائل ومشکلات کا احاطہ ممکن ہے۔ ایلن شوالٹر نے خواتین کے اُس ادب کو مُسترد کیا ہے جس میں خواتین نے مردوں سے وفاداری، پاک دامنی اور منصفانہ برتاؤ کا مطالبہ کیا ہے۔ ایلن شوالٹر اس طرح کے ادب کو محض اس بنیاد پر اہمیت نہیں دیتی چونکہ اس کے نزدیک تانیثی ادیباؤں نے مردوں کی عائد کردہ تعریفوں کے لیے نہ صرف راہ ہموار کی بلکہ اپنے آپ پر ظلم و جبر کورد کرتے ہوئے نسائی شناخت Female Identity کے باب کھول دیے ہیں۔ خواتین بہت حد تک اس امر پر مجبور ہیں کہ وہ ایک ایسا ادب تخلیق کریں جس کی جڑیں اُن کی روحانی دنیا میں پیوست ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی خودشناسی اور خوداعتمادی کے علاوہ خودنُمائی بھی شامل ہے۔ تانیثی تنقیدی شعور ہمیں مغربی خواتین کے حوالے سے سیمون دی بوائر Semon De Beauvior کی تصنیف The second sex اور The prime of Life میں بھی نظر آتا ہے۔ ان تصانیف میں مُصنفہ نے عورت کے وجود کا ایک فلسفیانہ تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ادب کے تجزیے اور تنقید سے لے کر ادب کی اشاعت تک مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔

تانیثی تنقید اس بات پر زور دیتی ہے کہ عورت کی سائیکی پر چونکہ پدری سماج کی گرفت مضبوط رہی ہے اور اُس کی ذہنی وجذباتی دُنیا میں مرد کا جابرانہ تسلّط اس قدر حاوی رہا ہے کہ عورت کائناتی سطح پر سوچنے سے محروم رہی ہے۔ لہٰذا اس حصار سے عورت کو آزاد کیا جائے اور اُسے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی اُن فطری صلاحیتوں کا اظہار کر سکے جو قدرت نے اُسے ودیعت فرمائی ہیں۔ علاوہ ازیں تانیثی تنقید اُن پوشیدہ اور مستور گوشوں کو بھی طشت ازبام کرتی ہے جو کسی نہ کسی زاویے سے عورت کے ثقافتی اور جنسی خیال کے فرق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم مکتبۂ فکر عورت اور مرد کے مابین عورت کی منفرد شناخت کو ختم کر کے اُسے مرد غالب سماج میں دوسرے درجے کا شہری بنا دیتا ہے۔ اس طرح وہ عورت کو دائرۂ اقتدار سے باہر کر دیتا ہے۔ تانیثی تنقید ان تمام امتیازات

کومسترد کرتے ہوئے اس بات کو اہمیت دیتی ہے کہ عورت کی ذاتی قدر، قوت، شناخت، خودداری، خود پسندی مرد اور خاندان کے ساتھ اُس کے نئے رشتوں کو اُستوار کیا جائے۔

اُردو میں تانیثی تنقید کا نقش اوّلیں ایک تذکرہ ''شمیم سُخن'' کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس میں شاعرات کے مختصر سوانحی کوائف کو اُن کے کلام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے مگر اُس دور کی خواتین کی شعری تصنیفات سے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ یہ کسی عورت کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر ہے کیونکہ وہ بامر مجبوری اپنا مافی الضّمیر کا اظہار اُسی انداز سے کرتی تھیں جیسے مرد قلم کار کرتے تھے۔ گویا تا ایں وقت عورتوں میں یہ احساس بیدار نہیں ہوا تھا کہ صنفی حیثیت سے اُن کے اپنے کیا کچھ مسائل اور محسوسات ہیں جنھیں وہ اپنے انداز میں سمجھ کر اُن سے متعلق حقائق سے واقف ہو کر اُنھیں صفحۂ قرطاس پر لاسکیں۔ یہ تو تسلیم شُدہ امر ہے کہ عورتوں کے اپنے مسائل، محسوسات، جذبات واحساسات، اپنی سماجی اور انفرادی زندگی کے علاوہ اُن کی اپنی مخصوص آئیڈیالوجی اور سائکی ہے۔ عورتوں کی اپنی آواز ہے مگر یہ اُسی وقت قابل پہچان ہوگی جب صنفی حیثیت سے خواتین نے بذاتِ خود اس کا اظہار کیا ہو۔

اُردو ادب کی مختلف اصناف کا تاریخی اور تنقیدی تجزیہ کرنے سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہاں بھی 'عورت' ادب کا ایک خاص موضوع رہی ہے۔ داستانوں، ناولوں، قصوں، کہانیوں اور شعری اصناف بالخصوص غزل، مثنوی، رُباعی اور نظم میں عورت کی ذات اور اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نت نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ شاعری میں شاعروں کا محبوب ترین موضوع عورت ہی رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے شعراء نے ایک طویل مدت تک عورت کے حسن و جمال، آرائش وزیبائش اور اُس کے ناز وادا، اس کے خدوخال کی کشش وجاذبیت، زلفوں کے پیچ وخم اور مرد سے اُس کے رومانوی، نفسیاتی اور جذباتی تعلقات کے پُر لطف تذکروں سے اپنی شاعری کے گیسو سنوارتے رہے ہیں۔ میرے اس بیان کی تصدیق شہناز نبی کی اس معتبر رائے سے ہوجاتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ہندوستانی ادب میں عورت کے کچھ کردار جوں کے توں پیش کیے

گئے۔ یعنی سماج کے چلتے پھرتے کردار اور کچھ ایسے جیسا کہ
مرد ادیبوں کی تمنا تھی وہ کالی داس کی شکنتلا ہو یا علی عباس حسینی کی
صابرہ، انتظار اُس کا مقدّر رہے۔ قسمت پر صابر و شاکر رہنا اُس کی
نمایاں صفت اور خدمت گزار اور فرماں بردار ہونا اُس کی ایڈیشنل
کوالیفکیشن ہے'' (Additional Qualification)

1960ء کے بعد ایسی شاعرات منصۂ شہود پر نظر آنے لگیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تخلیقی بصیرت کے باوصف نہ صرف اپنے وجود کا احساس دلایا بلکہ ان حصاروں کو توڑ کر باہر نکلنے کی جسارت کی اور ایسے ایسے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے لگیں جس کی اُمید صنف نازک سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مثلاً یہ سوال اُٹھایا گیا کہ ایسے سماج میں جہاں تمام تر فیصلوں پر مرد کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔عورت کا کیا مقام ہے؟ ایک سوال یہ بھی کہ تولیدی عمل میں عورت کا ناگزیر ترین حصہ ہونے کے باوجود اولاد کی شناخت ماں کے بدلے پدری حوالوں سے ہی کیوں کی جاتی ہے یا پھر مرد و زن کے درمیان رشتوں میں محکومیت اور خودسپردگی کے سوال پر اس کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل ایسے موضوعات رہے ہیں جن پر خواتین شعرا کا ردِعمل جاننا قاری کے لیے ایک دلچسپ تجربہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان خواتین شعرا کے یہاں دو قسم کے فطری رویّے سامنے آتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ایسی شاعرات جنھیں مرد کی حاکمیت اور بالا دستی پر سوالیہ نشان لگانا اور اُن تمام روایتی فکری ڈھانچوں کو توڑنا جو عورت کو محکومیت کے درجے پر متمکن کرتے ہیں اور دوسری ایسی شاعرات ہیں جنھوں نے خودسپردگی کی لذت میں رشتوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے تانیثی فکر و احساس کو شعری قالب میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر لسانیت کا یہ سحر بھی کب تلک اُن کی شاعرانہ فکر کو تازگی عطا کر سکتا ہے، مزید یہ بھی کہ کیا موجودہ ادبی تناظر میں صرف نسائی موضوعات پر مبنی شاعری کو عظیم شاعری کے دائرے میں داخل کیا جا سکتا ہے؟ دراصل آج کی شاعرات غور و تدبر میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی طرح کے موضوعات کو مختلف اُسلوب یا پیرائے میں دہراتے دہراتے اب اُن کے یہاں بھی

یکسانیت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ موجودہ دور کی خواتین شاعرات اپنی منفرد پہچان کی حیثیت سے اپنے جذبات واحساسات کوشعروں میں ڈھال رہی ہیں اور مرد شاعر حضرات کی شاعری میں بھی بے باکی نمایاں صورت میں جھلکتی ہے۔ گذشتہ پانچ دہائیوں کے خواتین ادب کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد یہ اصلیت سامنے آتی ہے کہ یہ ادب ثقافتی تانیثیت کے زُمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو خواتین قلمکاروں نے مغربی ادیباؤں کی طرح دانستہ یا نادانستہ طور پر اس صداقت کوتسلیم کیا ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں کا عمل اتنا سہل نہیں۔ اس لیے اُنھوں نے ان سماجی اقدار کونظرانداز کر کے ایک متبادل دائرۂ کار دریافت کرلیا ہے۔ مردوں کونشانہ بنائے بغیر اُنھوں نے براہِ راست اس بھونڈے سماجی نظام کونشانہ بنایا ہے جوخواتین کواستبداد میں رکھتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے ایک الگ رویّہ اپنایا اور اظہار کے لیے لسانی تبدیلیوں کوبھی ضروری خیال کیا۔

تانیثی تنقید کے سلسلے میں تنقید نگاروں کے دوگروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ مردوں کا ہے کہ جنھوں نے خواتین قلم کاروں کی نگارشات کا تنقیدی تجزیہ کر کے اُن کی آواز سے آواز ملائی ہے اور دوسرا گروہ وہ خواتین ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات (چاہے وہ شاعری ہو یا فکشن) میں مرد غالب معاشرے کو یا بھونڈے سماجی نظام کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا بلکہ براہِ راست ایسے انتقادی مضامین لکھے ہیں جن کا تعلق نسائیت اور تانیثی فکر وشعور سے ہے۔ جہاں تک مرد تانیثی تنقید نگاری کا تعلق ہے اُن میں اہم اور معتبر نام پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ظہورالدّین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر علی احمد فاطمی، افتخار امام صدیقی، عظیم الشان صدیقی، مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر محمد شہزاد شمس، شافع قدوائی، ناصر عباس نیر، ناصر علی بدایونی، حقانی القاسمی اور ہمایوں اشرف کے علاوہ کچھ اور بھی نام ہوسکتے ہیں۔ تنقید نگار خواتین میں ممتاز شیریں، رشید جہاں، شمیم نکہت، صغرا مہدی، کشور ناہید، زاہدہ حنا، ترنم ریاض، شہناز نبی، ثروت خان، شبنم آرا، فہمیدہ کبیر، شائستہ فاخری، نگار عظیم اور رضوانہ کے علاوہ کچھ اور بھی خواتین ہیں جنھوں نے خواتین کے مسائل، اُن کی نفسیاتی، جنسی اور

داخلی کیفیات کو تانیثی نقطۂ نظر سے جانچا پرکھا اور نہایت سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جہاں اُردو دُنیا کو ساختیات، پسِ ساختیات، ردِّ تشکیل، مشرقی شعریات، متن اور قاری اساس تنقید کے علاوہ مابعد جدیدیت جیسی نئی ادبی اصطلاحات سے متعارف کرایا تو وہیں اُنھوں نے تانیثیت اور نسائیت پر بھی تحریری طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی (مرحوم) کی تصنیف ''مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات'' (2004ء) کے عنوان سے ایک جامع مضمون شامل ہے جس میں مصنف نے مابعد جدیدیت کی تمام جہات پر مغربی ومشرقی مفکروں کے حوالوں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ تو وہیں مذکورہ کتاب میں ''مابعد جدیدیت اور تانیثیت'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون شامل ہے جس میں چند مغربی خواتین دانشوروں کی تانیثی فکر واحساس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید کے بانی ہیں۔ وہ اکتشافی تنقید کے نظریے سے تمام قدیم وجدید شعر وادب کو جانچنے پرکھنے کے روادار ہیں۔ اُنھوں نے اپنے متعدد تنقیدی مضامین میں تانیثیت اور اس کے مقتضیات کی صراحت میں کسی بھی ادبی انتہا پسندی سے کام نہیں لیا ہے۔ عورت کی بہتر پوزیشن پر وہ بھی مصر نظر آتے ہیں۔ تانیثی تنقید کے حوالے سے پروفیسر عتیق اللہ کا نام نہایت معتبر ہے۔ دہلی یونیورسٹی میں اُردو کے ایک ذہین ومتین پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے پہلی مرتبہ ''بیسویں صدی میں خواتین اُردو ادب'' کے موضوع پر آج سے تقریباً تیرہ سال قبل ایک ملکی سطح کا سیمینار منعقد کروایا تھا کہ جس میں اُردو کے اہم محققین، ناقدین اور دانشوروں نے تانیثیت، نسائیت اور تانیثی ادب کے حوالے سے نہ صرف مقالات پڑھے تھے بلکہ مباحثے اور مذاکرے میں بھی حصہ لیا تھا۔ تمام مقالات کو پروفیسر عتیق اللہ نے مرتب کر کے 2002ء میں کتابی صورت میں شائع کروایا۔ اس طرح پہلی مرتبہ خواتین اور مرد ادیبوں کو ایک ایسے پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا موقع ملا کہ جہاں اُنھیں خواتین کے مسائل اور معاشرتی نظام میں اُن کی حیثیت کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ہی اُردو شعبوں میں تانیثیت اور تانیثی ادب پر تحقیقی کام کروانے کی شروعات بھی ہوئی۔ پروفیسر ظہور الدّین کی تصنیف ''تنقیدی مباحث وتجزیے'' جو 2007ء میں شائع ہوئی

ہے اس میں ایک مضمون ''اُردو شاعری میں نئی نسوانی آوازیں'' اُردو کی اُن چند نمائندہ نئی خواتین کی شاعرانہ عظمت اور اُن کے ادبی وقار کو اُجاگر کرتا ہے جو بیرونِ ہند کی اُردو بستیوں میں اپنا سفرِ حیات طے کر رہی ہیں اور وہاں کے ماحول و معاشرے میں اپنے آپ کو کیسا محسوس کرتی ہیں۔ یہ تمام باتیں مذکورہ مضمون میں بیان کی گئی ہیں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ایک بالیدہ ذہن اور کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے اُردو ادبی حلقوں میں معروف و مقبول ہیں۔ نسائیت کا مطالعہ اس کی افہام و تفہیم اُن کے ادبی مشغلے میں شامل ہے۔ اُن کے اکثر تنقیدی مضامین میں عورتوں کی سماجی، ذہنی، نفسیاتی اور ادبی صورت حال کا ذکر آیا ہے۔ ''فکر و تحقیق'' کے ''نیا افسانہ نمبر'' (2013ء) میں ابوالکلام قاسمی کا مضمون ''معاصر خواتین افسانہ نگار: مسائل و مشکلات'' تانیثی تنقید کے زُمرے میں آتا ہے۔ تانیثی تنقید کے حوالے سے عظیم الشان صدیقی کی تصنیف ''اُردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ'' پروفیسر علی احمد فاطمی کی تصنیف ''تحریک نسواں اور اُردو ادب'' محمد شہزاد شمس کی کتاب ''عورت اور سماج'' توحید خان کی ''مرزا رسوا کے ناولوں میں نسوانی کردار'' کے علاوہ شافع قدوائی کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ''فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر'' میں شامل اُن کا بصیرت افروز مضمون ''معاصر ناول کے نسوانی کردار: ایک تانیثی کردار'' ناصر عباس نیر کا مضمون ''تانیثیت اور جدید نظم'' حقانی القاسمی کا مضمون ''تخلیق کے نسائی رنگ'' اور ہمایوں اشرف کا مضمون ''نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک'' کا تعلق تانیثی تنقید کے ایک نئے منظر نامے سے ہے۔ افتخار امام صدیقی نے اپنے معیاری ماہنامہ ''شاعر'' میں عالمی خواتین ادیباؤں کو متعارف کرایا اور نسائیت و تانیثیت سے متعلق نہایت معلوماتی مضامین شائع کیے۔

خواتین تنقید نگاروں میں ممتاز شیریں کو ایک منفرد اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنی تنقیدی اور فنی بصیرت کے ذریعے اُردو کے ادبی حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ممتاز شیریں نے تانیثی فکر و احساس کو مخصوص نسائی لہجے میں بیان کیا۔ بالخصوص عورت کی نفسیاتی کائنات اور اُس کے جنسی مسائل کو بڑی بے باکی سے بیان کرتی چلی گئی ہیں۔ ممتاز شیریں کے بعد اُردو ادب میں مردانہ سماج کی بالا دستی، ظلم و استحصال، خواتین کی گھروں میں

گھٹن، مردوں کا مذہب کی آڑ میں عورت کی آزادی کو سلب کرنا، توہم پرستی اور ازدواجی رشتوں میں شوہر کی بالا دستیاں بلکہ زبردستیاں اور دباؤ کو سب سے پہلے اپنی تحریروں میں جس خاتون نے تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا وہ رشید جہاں تھی۔ اس خاتون کو آزادیٔ نسواں کی پہلی علمبردار خاتون تصور کیا جاتا ہے۔ شمیم نکہت کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار'' صغرا مہدی کی تصنیف ''ہندوستان میں عورت کی حیثیت'' اور ''اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت'' کشور ناہید نے ''عورت: خواب اور خاک کے درمیان'' زاہدہ حنا نے ''عورت زندگی کا زنداں'' ترنم ریاض نے ''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب'' شہناز نبی نے ''فیمینزم جرمنی میں'' شبنم آراء نے ''تانیثیت کے مباحث اور اُردو ناول'' فہمیدہ کبیر نے ''اُردو ناول میں عورت کا تصور'' نیلم فرزانہ نے ''اردو افسانے کے فروغ میں خواتین کا حصہ'' اور رضوانہ نے ''1950ء کے بعد خواتین افسانہ نگار'' جیسی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں تانیثی تنقید کے بہتر نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اُردو کی دو اہم تخلیق کار اور تنقید نگار خواتین، نگار عظیم اور شائستہ فاخری نے تانیثی تنقید میں امتیازی حیثیت حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی کے سہ ماہی ''فکر وتحقیق'' (2013ء) کے ''نیا افسانہ نمبر'' میں نگار عظیم کا مضمون ''1970ء کے بعد افسانے میں عورت'' اور شائستہ فاخری کا مضمون ''نسائی ادب، خواتین تخلیق کار اور نیا اُردو افسانہ'' تانیثی فکر و شعور اور نسائیت کے کئی مستور گوشوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی شمارے میں ترنم ریاض کا مضمون ''اُردو کی ادیبائیں: منظر پس منظر'' صالحہ زریں کا ''اُردو کے نئے افسانوں کی بدلتی صورتیں: ایک مطالعہ'' ناظمہ جبیں کا ''چند افسانوی کردار: تکنیک اور وضاحت'' یہ تمام مضامین اس لحاظ سے قابل توجہ ہیں کہ ان کا تعلق تانیثی ادب کے ایک نئے ڈسکورس سے ہے۔ حال ہی میں پروفیسر عبدالقادر غیاث الدّین فاروقی کی کتاب ''کنیڈا، متحدہ ریاست امریکہ میں خواتین کی اُردو خدمات'' کے نام سے تانیثی ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئی ہے۔ جس میں پروفیسر موصوف نے نہایت عرق ریزی سے اُن پچیس اُردو کی اہم ادیباؤں کو اُن کی تصاویر اور ادبی گفتگو کے ساتھ متعارف کروایا ہے کہ جو کنیڈا اور متحدہ

ریاست امریکہ میں تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی طور پر اُردو کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ تانیثی تنقید میں عورت ہی کے نظریے سے روشنی ڈالی جاتی ہے کیونکہ اُن کی سائکی، اُن کے جذبات و احساسات، محسوسات و مسائل تک ہر مرد ناقد کی پہنچ ناممکن ہے۔ عورتوں کی فکر و شعور کی اپنی سرحدیں ہیں، جنھیں وہ خود پھلانگ سکتی ہیں۔ روایتی ناقدین نے جو کچھ اُن کے بارے میں لکھا ہے وہ بہت حد تک اُن کی خود ساختہ فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی روایتی حصار کو توڑنے کے لیے خواتین نے تانیثی تنقید یعنی Gynocriticism کو ایک آزادانہ فکری عمل قرار دیا ہے۔ تانیثی علمبردار خواتین نقاد بہت حد تک اپنی فکر، احساس اور شعور و ادراک میں منطقی نظر آتی ہیں۔

....

حواشی:

1۔ ''نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک'' مشمولہ، سہ ماہی ''تحریک ادب'' مدیر۔ جاوید انور، وارانسی بنارس، شمارہ 14 سن 2012ء ص 39

2۔ ''مرد ادیبوں کے فکشن میں عورت کا تصور اور کردار'' مشمولہ۔ ''بیسویں صدی میں خواتین اُردو ادب'' مرتبہ۔ پروفیسر عتیق اللہ، ص 14

☆☆☆

انجم عثمانی کی ایک کہانی ''وہ ایک بوڑھا'' کا تجزیہ

انجم عثمانی ہمارے اُن معتبر افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف ادب، غیر ادب اور تخلیقی ادب کے اسرار و رموز سکھائے بلکہ اخلاقی، روحانی اور تہذیبی قدروں کو بھی ایک خوشگوار، متوازن اور پر سکون زندگی کے لیے لازمی قرار دیا۔ ادب اور سماج کا رشتہ نہایت مربوط تصور کیا جاتا رہا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے حالات وواقعات ایک حساس قلمکار کے ذہن ودل کو متحرک کرتے رہتے ہیں۔اُسے دعوت فکر دیتے ہیں۔ تب وہ سماج میں وقوع پذیر حالات وواقعات کو تجربے ومشاہدے کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور حاصل شدہ تجربے کے لیے فن کا سہارا لیتا ہے۔ ایک شریف النفس اور مہذب انسان کی طرح انجم عثمانی کو بھی انسانی قدریں نہایت عزیز ہیں۔ اصل میں ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ جس ماحول ومعاشرے میں گزرا۔ وہ اخلاقی، روحانی اور تہذیبی قدروں کا گہوارہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے یعنی بقول انجم عثمانی:

> ''میں دیوبند ضلع سہارنپور اتر پردیش کے مشہور علمی دینی ادبی خاندان میں پیدا ہوا۔ دیوبند کا عثمانی خاندان صدیوں سے علم وادب شریعت وطریقت کا امین ہے''

انجم عثمانی کی طرح میرے دل میں بھی انسانی قدروں کی اہمیت عظمت وافادیت بہت زیادہ ہے۔ قدریں چاہے اخلاقی ہوں یا روحانی وتہذیبی ان کی بحالی کے بغیر ایک خوشگوار وپر وقار زندگی کا حصول ناممکن ہے۔مانا کہ وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔نئی

نئی سائنسی وتکنیکی چیزوں کی آمد سے ہماری زندگی سہولیات سے ہمکنار ہوسکتی ہے لیکن تمام علوم وفنون اور فکر وفلسفے کا بنیادی مقصد تو آدمی کو انسانی صفات سے متصف کرنا ہے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ کسی سماج ومعاشرے میں انسانی اقدار کی شکست وریخت سے مایوس کن صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ آج ہم جس سماج ومعاشرے میں سانس لے رہے ہیں اس میں اخلاقی وروحانی اقدار کا فقدان ہے جس کے باعث وہ معاشرہ انتشار واختلال کا شکار ہے۔ ایک ادیب سماج کا وہ ذمہ دار فرد ہوتا ہے جو حیات وکائنات کی گہرائیوں اور گیرائیوں پہ نظر رکھتا ہے۔ زندگی کے نشیب وفراز اسکی صداقتوں اور آئے دن رونما ہونے والے حالات وواقعات سے اسکا سروکار سطحی بنیادوں پہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے نوک قلم سے ایک ایسا جہاں سجاتا ہے جس میں بصارت وبصیرت کی کئی پرچھائیاں ابھرتی چلی جاتی ہیں۔ صداقت پسندی اور پائدار طرز فکر کے ساتھ وہ انسانی ذہن سازی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ وہ مبلغانہ انداز بیان سے پرے رہ کر اپنے قاری کے لیے بصیرت کا ایک ایسا سامان فراہم کرتا ہے کہ وہ خود سوچے کہ کیا ہونا چاہیے اور ہو کیا رہا ہے؟ انجم عثمانی نے اپنے افسانوں میں زندگی کی صداقتوں کو فنی جامہ پہنایا ہے۔ انکے بیشتر افسانوں میں انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور یاد ماضی عذاب ہے یارب کا احساس جاگزیں ہے۔ وہ ایک طرح کے نسلی بُعد (Generation gap) میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے انجم عثمانی کی کہانیوں کے حوالے سے جو رائے قائم کی ہے وہ حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ ایک مخصوص تہذیبی ومعاشرتی پس منظر سے نکل کر آتے ہیں اور زندگی اور انسانوں کے درمیان ایک محبت آمیز، اخلاق انگیز رشتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ترقی کے نام پر شکستی وسنگدلی کی تصویریں اور تعبیریں دیکھ کر حیران وپریشان ہوتے ہیں لامحالہ انھیں ماضی کا کرب اور وحشتوں کا درد گھیر لیتا ہے۔ یہ بھی ایک فطری عمل ہے۔ انجم عثمانی کی بیشتر کہانیاں اسی کھو جانے کے احساس میں گم معنی

خیز اور فکر انگیز اشارے اور سفاک حقیقت کے شرارے پیش کرتی ہیں'' (مشمولہ 'انتساب'' شمارہ۔اپریل جون 2015ء ص224)

اختصار نویسی انجم عثمانی کی کہانیوں کی ایک نمایاں خوبی ہے۔اُن کی کہانیوں میں ہمیں ایک بے رحم کائنات نظر آتی ہے جہاں بیک وقت نئی اور پرانی تہذیب کا امتزاج اُن کی کہانیوں کو طلسماتی بنا دیتا ہے۔وہ کھوئی ہوئی قدروں، روایات اور تہذیبوں کے متصادم رویّوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں۔وہ حقیقت نگاری کے قائل ہیں۔اس لیے اپنی کہانیوں کو کذب سے پاک رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔وقت کے گزران میں تغیر کا عمل دخل تو یقینی ہے لیکن انجم عثمانی کی کئی کہانیاں اک داخلی درد و کرب کا احساس کراتی ہیں اور پڑھنے والے کو یہ تاثر دلاتی ہیں کہ کاش! تغیر نام کی کوئی بھی چیز دنیا میں نہ ہوتی۔انجم عثمانی کی ایک کہانی ''وہ ایک بوڑھا'' زماں و مکاں کے اسی چکرویہ کا گہرا احساس دلاتی ہے۔اس کہانی میں ایک بوڑھے آدمی کے کردار کے ذریعے سے ایک ناقابل تردید حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔انسان جب گردش ایام میں بچپن، لڑکپن اور جوانی کے اسٹیج سے اُتر کر بڑھاپے کی وحشت ناک وادی میں قدم رکھتا ہے تو اپنا آپ ہی اسے ایک بار گراں معلوم ہونے لگتا ہے۔دھیرے دھیرے اسکے حواس خمسہ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ دُوسروں کی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے۔زیر نظر کہانی میں ایک بوڑھا سوا مہینے کی گل گوتھنی سی بچّی کو اپنے بازوں میں جھولانے اور اسے چومنے کی آرزو میں کہانی کے راوی سے لیتا ہے مگر وہ اسکے رعشہ زدہ ہاتھوں سے نیچے گر جانے سے بال بال بچ جاتی ہے کیوں کہ دوسرا آدمی لپک کر فوری طور پر بچی کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔یہ سب دیکھ اُس کی بہو بوڑھے کو ڈانٹتی ہے۔اس واقعے سے پہلے بھی ایک بار اسی بوڑھے آدمی کے ہاتھوں سے چائے کا ایک سیٹ نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔جس پہ گھر کے افراد کی ناراضگی کا اظہار ایک کہرام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔بوڑھا عمر رسیدہ ہے۔عجیب و غریب قسم کا بوڑھا جو اپنی مرضی سے گھر میں آتا ہے اور اپنی مرضی سے باہر چلا جاتا ہے۔کبھی کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے اسکی حرکات و سکنات سے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی نفسیاتی مریض ہو جو اپنے ادھورے ارمانوں

کی تکمیل میں یوں ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا ہو۔اس کہانی کا ایک ضمنی کردار بھی ہے جو صیغۂ واحد متکلم میں اس بوڑھے شخص کا حال اور چال بیان کرتا ہے۔بعض مقامات پہ کہانی کا راوی یعنی ''میں'' اچانک اپنے موضوع سے ہٹنے کا احساس دلاتا ہے کہ اس کا اصل موضوع تو بوڑھے شخص کی نفسیاتی کیفیات اور اسکی بے بسی کا اظہار کرنا ہے مگر وہ کبھی فلسفہ طرازی پہ اور کبھی اپنا ہی حال دل بیان کرنے لگ جاتا ہے۔ دراصل زیر نظر کہانی میں انجم عثمانی نے بڑھاپے کے کئی خوفناک پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔گویا وہ اس کہانی کے ذریعے ہمیں نہ صرف ایک بوڑھے آدمی کی نفسیاتی کیفیت اور جسمانی ضعف سے واقفیت کرواتے ہیں بلکہ اس حقیقت کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ بڑھاپے میں اپنے اور پرائے سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنا آپ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ نئے لوگ پرانوں کی جگہ سنبھال لیتے ہیں اور یہی دراصل زندگی کی تلخ حقیقت ہے۔

مذکورہ کہانی سے ماخوذ ایک اقتباس انسانی رشتوں میں ناپائداری اور بے مروتی کا احساس دلاتا ہے۔مثلاً:

> ''بچی کو گرچہ شکر ہے چوٹ نہیں لگی تھی لیکن میں سہم سا گیا تھا۔گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو بوڑھا غائب تھا۔ضرور ہمیشہ کی طرح گھر کے دروازے کے باہر بیٹھا ہوگا اور اس انتظار میں ہوگا کہ میں جا کر اسے منا لاؤں۔ بے وقوف سنکی بھلا میں کیوں مناؤں۔ میں کیوں جاوں یہاں گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔میرے بیٹے نے یہ نیا فلیٹ خریدا ہے۔پہلی بار پوتی کو لے کر ہم سب یہاں آئے ہیں۔لوگ مبارک باد کے لیے یہاں جمع ہیں اور یہ بوڑھا عجیب بوڑھا ہے۔ یہ خود ہی روٹھتا ہے خود ہی من جاتا ہے۔خود بخود کبھی بھی میرے پاس آدھمکتا ہے اور یوں ہی بغیر کہے چل دیتا ہے۔کبھی دنوں مہینوں نظر نہیں آتا۔ کبھی روز آجاتا ہے۔کبھی آتا نہیں۔کبھی آتا ہے تو جاتا نہیں عجیب ہے یہ بہت عجیب''

پوری کہانی میں ایک مایوس کن فضا تیار کی گئی ہے۔ سسکتے جذبات و احساسات ایک مخصوص تاثر میں ڈھل کر دنیا کی بے ثباتی، رشتوں کی ناپائداری اور بڑی سرعت سے وقت کے گزرنے کا احساس دلاتے ہیں۔ بین السّطور میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا اصل میں توشۂ آخرت تیار کرنے کا میدان ہے نہ کہ تفریح گاہ۔ انجم عثمانی کی یہ کہانی اُن کی روایتی کہانیوں سے بالکل جداگانہ ہے اور کسی حد تک اُنھوں نے اس میں شعور کی رو کی تکنیک کو برتا ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

....

اکیسویں صدی میں اُردو کے مسائل

اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی، مختلف ادوار میں اس نے ترقی کے مراحل طے کرنے کے بعد عوام میں اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ یہ نہ صرف ہندوستان کے کسی ایک خطے تک محدود رہی بلکہ پورے برصغیر کے عوام کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ دراصل اُردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ایک تہذیب کا نام بھی ہے۔ میں اُردو کو اس کی فطری کشش، مٹھاس، مشترکہ تہذیبی تشخص کی امین اور اس کی لسانی خصوصیات کی بنیاد پر شہد سے تعبیر کرتا ہوں کیونکہ جس طرح شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں کا رس اور نہ جانے قدرت کی کتنی انمول نعمتوں کو مخصوص مقام پہ لا کے شہد تیار کرتی ہیں، اُسی طرح اُردو نے عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، پنجابی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنے رنگین دامن میں سمیٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو سے محبت کرنے والے دُنیا کے تقریباً ہر ملک میں موجود ہیں۔ ہندوستان کے بٹوارے سے قبل پورے برصغیر میں اُردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد کچھ فرقہ پرست تنظیموں نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا جس کی وجہ سے یہ زبان تعصب کا شکار ہوئی۔ اس بات میں کوئی تامل نہیں کہ اُردو ایک سیکولر زبان ہے۔ یہ وہی زبان ہے جس نے ہندوستان کی آزادی میں ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا۔ اُردو کو جہاں امیر خسرؔو، میر تقی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، سر سید احمد خان، محمد حُسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، حالؔی اور مولانا شبلی جیسے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات اور افکار و نظریات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو

وہیں پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی پریم چند، کرشن چندر، سدرشن، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، رام لعل، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، سریندر پرکاش، کشمیری لال ذاکر، نند کشور وکرم، گوپی چند نارنگ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پروین کمار اشک، سردار پنچھی، عرش صہبائی، پرتپال سنگھ بیتاب، شام طالب، بلراج بخشی، پیارے ہتاش، عشاق کشتواڑی، ودیارتن عاصی، دیپک آرسی، پریمی رومانی، دیپک بدکی، دیپک کنول بیتاب جے پوری اور آنند سروپ انجم کے علاوہ ہزاروں ہندو اور سکھ شاعروں وادیبوں نے گلستان اُردو کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اُردو غزل، قوالیوں اور گیتوں کے سحر سے کون مسحور نہیں ہوتا۔ آج بھی اُردو غزل اور گیتوں کو سننے والے اپنا سر دُھننے لگتے ہیں۔ صحیح اُردو بولنے والے کو عوام بلا لحاظ مذہب وملّت پسند کرتے ہیں۔ اُنھیں اُردو کی مٹھاس اور ادا بھاتی ہے۔ اُردو کی مقبولیت، اہمیت وعظمت مسلّمہ ہے، مگر اس کے باوجود آج جب کہ ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سانس لے رہے ہیں اور جسے سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کا دور کہا جاسکتا ہے کہ جہاں پوری دُنیا ترسیلی اور مواصلاتی ذرائع کی وجہ سے ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کرگئی ہے، وہاں اُردو کی بقا اس کی ترقی اور نشر واشاعت سے متعلق کچھ ایسے مسائل پیدا ہوچکے ہیں جن پہ غور وفکر کرنا ہم سب اُردو والوں کی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

اگر ہم اُردو کے مسائل کی بات کریں تو سب سے بڑے دُکھ کی بات یہ ہے کہ اُردو اپنے ہی وطن یعنی ہندوستان میں اجنبی ہو کے رہ گئی ہے۔ ہندی اگر ہندوستان کی قومی زبان ہے تو اُردو کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ یہ قاعدہ کُلیہ ہے کہ زبان وہی کسی ملک میں پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہے جس کو بولنے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی ایک بھاری تعداد میسر ہونے کے علاوہ سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہو۔ جس طرح فارسی اور سنسکرت زبانیں ہندوستان میں کسی زمانے میں کافی مقبول اور ترقی یافتہ تھیں لیکن جب یہ زبانیں عوام کے بدلے صرف راج درباروں اور کٹّر دھرم پنتھیوں تک محدود ہوکر رہ گئیں تو دھیرے دھیرے یہ زبانیں زوال پذیر ہوگئیں۔ آج انگریزی زبان انگریزی میڈیم اسکولوں کی وجہ سے بہت ترقی کرچکی ہے۔ اُردو کے بدلے اب علاقائی زبانوں میں لکھنے

پڑھنے کو ترجیح دی جارہی ہے۔ اُردو اگر کہیں زندہ ہے تو اپنی فطری مٹھاس اور کشش کے سبب زندہ ہے۔ ہندوستان سے باہر بھی اُردو کی بستیاں آباد ہیں لیکن وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات ہم تک بآسانی نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں اُردو کی بُو باس موجود ہے وہاں اُردو والوں کے اپنے مسائل ہیں۔ فرقہ پرست تنظیمیں بڑی سُرعت کے ساتھ اُردو دُشمنی کے بیج بو رہی ہیں۔ ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں کئی بچّے اسکولوں میں اُردو پڑھنا چاہتے ہیں مگر اُردو اساتذہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہ اُردو سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ اُردو ایک مشکل زبان ہے، حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مُسلم صاحب ثروت لوگ اپنے بچّوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخل کرواتے ہیں اور اُردو کے بدلے انگریزی پڑھانے پر زیادہ زور دیتے ہیں، اچھی بات ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے لیکن اُنھیں اس بات کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ ہمارے بچّے اُردو کے بغیر مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے پسماندہ رہیں گے۔

ہوائی اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈوں، چوک چوراہوں، سرکاری وغیر سرکاری اداروں اور عمارتوں پہ اُردو کے سائن بورڈوں کا ہونا ازحد ضروری ہے، لیکن یہ سائن بورڈ بھی ہمیں ہندوستان کے اکثر شہروں میں نظر نہیں آتے۔ انگریزی زبان اگر بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے تو اُردو بھی ہندوستان میں ایک رابطے کی زبان کا درجہ رکھتی ہے یعنی کنٹر، تلگو، ملیالم، پنجابی، ہندی، ڈوگری، کشمیری اور کئی دوسری زبانوں اور بولیوں والے لوگ اُردو بآسانی سمجھتے ہیں اور اُردو میں بات بھی کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود اُردو کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ لیجیے جموں وکشمیر کی طرف آتے ہیں کہ جہاں اُردو کو کاغذوں میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن اُردو کی عملی صورت حال یہاں نہایت مایوس کن ہے۔ یوپی اور بہار میں جس طرح ہندی میں تمام دستاویزات تیار کیے جاتے ہیں اور ہر سرکاری وغیر سرکاری ادارے میں ہندی کو دفتری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر یہاں نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ اُردو جموں کشمیر کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود یہاں تمام سرکاری وغیر

سرکاری دفاتر میں کاغذی کاروائی انگریزی میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اب پولیس، محکمۂ مال اور عدالتوں میں بھی انگریزی میں رپورٹیں، حکمنامے اور درخواستیں وغیرہ تیار کی جانے لگی ہیں۔ ہندوستان کی کچھ ریاستوں میں اُردو اکیڈمیاں قائم ہیں لیکن جموں وکشمیر میں اُردو اکیڈمی نہیں ہے۔ صوبہ جموں میں اسکولوں میں اُردو اساتذہ کی عدم دستیابی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ذہین، محنتی اور باصلاحیت اُمیدواروں کے بدلے سفارشی یا جیب بھرو کی بنیاد پر نااہل اُمیدواروں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ صحیح اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد قلیل ہے۔ تلفّظ اور املائی غلطیاں کفِ افسوس ملنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کچھ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ایم فل اور پی ایچ ڈی سند یافتہ نوجوان اُردو کی بےلوث خدمت کے جذبے سے عاری ہیں۔ اُن کا مقصد اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے اُردو کے لیکچرر بن جائیں۔

اُردو کے مسائل میں ایک تشویشناک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اُردو والوں میں گروہ بندیاں ہیں اور میں وثوق سے یہ بات کہتا ہوں کہ اُردو کو سب سے زیادہ نقصان گروہ بندیوں سے پہنچا ہے۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل، لیپ ٹاپ اور موبائل فون غرضیکہ یہ تمام چیزیں اُردو کے فروغ اور سہولیات اُردو کو عام کرنے میں موثر ثابت ہورہی ہیں مگر عام لوگوں کے ہاتھوں سے یہ چیزیں ابھی دور ہیں۔ اُردو کے اخبارات ورسائل اور کتابیں خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ عوام اب کتابیں اور رسائل پڑھنے میں کم دلچسپی لے رہے ہیں کیونکہ وہ ٹیلی ویژن، موبائل فون، اور دوسرے برقی ذرائع ترسیل میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ غرضیکہ اکیسویں صدی میں اُردو کے مسائل بہت سے ہیں۔ اُن مسائل کا حل تلاش کرنا اُردو کی انجمنوں اور تحریکوں کی اہم ذمہ داری ہے۔

مرکزی حکومت اور بالخصوص ہماری جموں وکشمیر کی حکومت کو چاہیے کہ وہ اُردو کو اُس کا صحیح مقام دے۔ اُسے وہ تمام آئینی حقوق فراہم کرے جن کی اُردو مستحق ہے۔ اس کے لیے ہماری حکومت کو چاہیے کہ وہ دسویں کلاس تک اُردو کو لازمی مضمون قرار دے بلکہ اس بات کو بھی لازمی قرار دے کہ نوکری اُسے ملے گی جو اُردو پڑھنا، لکھنا جانتا ہو۔ علاوہ ازیں

کشمیر سیول سروسز کے لیے بھی اُردو کو لازمی قرار دیا جائے۔ جب اس طرح کی شرائط کو حکومت جموں وکشمیر تحریری اور عملی جامہ پہنائے گی تو یقیناً جموں کشمیر میں نہ صرف اُردو کا چلن عام ہوگا بلکہ ایک نئے منظر نامے کے ساتھ اُردو پڑھنے لکھنے والوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے کیونکہ جب حکومتیں کوئی فیصلہ لیتی ہیں اور پھر اُس کے نفاذ کے لیے عملی طور پر کچھ کرگزرنے لگتی ہیں تو حالات اور ماحول خوشگوار صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ ہندوستان کی مرکزی سرکار کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند اور ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی جیسے علم وادب کے ادارے اُردو کی بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔

....

ہمہ جہت شخصیت پر ایک اہم دستاویز

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی (حیات اور کارنامے)

محمد اطہر مسعود خان جدید اُردو ادب میں محقق، نقاد، افسانہ نگار، مترجم اور مولّف کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ علمی و ادبی ذوق وشوق اُنھیں ادبی میدان میں مسلسل سرگرم عمل رہنے اور کچھ نیا سے نیا کر دکھانے کی دُھن میں مُستغرق رکھے ہوئے ہے۔ محمد اطہر مسعود خان 28 جون 1961ء کو رام پور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ بارہویں درجے تک رام پور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی جیسی اعلیٰ ڈگری رُہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے حاصل کی۔ 1975ء میں اُن کا ادبی سفر ایک کہانی ''فرض اور ممتا'' سے شروع ہوا جو ماہنامہ ''نُور'' رام پور سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد محمد اطہر مسعود خان کے قلم سے جہاں بچّوں کے لیے کہانیاں سامنے آئیں تو وہیں اُنھوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنی ذہانت و قابلیت کا لوہا منوایا۔ اہم اور دقیق موضوعات پہ تحقیق و تنقید اُن کا مزاج بن چکا ہے، ورنہ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اُردو کے شعبوں میں ایک ہی موضوع پہ چار چار ریسرچ اسکالر کام کر رہے ہوتے ہیں اور وہ جملوں کو توڑ مروڑ کر ایک ہی بات کا اعادہ کرتے ہیں! اطہر مسعود خان نہ صرف تحقیق کے اُصول اور طریقۂ کار سے بخوبی واقف ہیں بلکہ دورانِ تحقیق اُن پہ عمل بھی کرتے ہیں۔ بحیثیتِ محقق اُن کے تحقیقی کارناموں میں ''اشاریہ ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنو ۱۹۵۵ء سے ۲۰۰۱ء تک'' رئیس رام پوری:

شاعری اور زندگی'' کے علاوہ ''ڈاکٹر حسن نظامی: حیات وخدمات'' شامل ہیں۔ یہ تمام تحقیقی کُتب اپنے عنوانات اور مطالعے سے اس امر کا انکشاف کرتی ہیں کہ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان میں ادبی تحقیق وتنقید کا جذبہ طلاطم خیز ہے کہ جو اُنھیں تحقیق کے بحرِ ذخار میں علم وادب کے موتی حاصل کرنے پر ہمہ وقت آمادہ رکھتا ہے۔ علم وادب کی دُنیا میں تحقیق کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں تحقیق کو سچ کا کاروبار کہتا ہوں۔ کسی اہم موضوع سے متعلق بہتر مواد کی فراہمی، مختلف آراء، مختلف ادوار میں متن وصحتِ متن کے علاوہ دلائل وشواہد اور معتبر مآخذ تک رسائی اور پھر تحقیق کار اپنا نقطۂ نظر کس طرح بیان کرے، یہ تمام مسائل ومباحث علمی وادبی تحقیق سے براہِ راست مُنسلک ہیں اور محقق قدم قدم پہ جہاں ذہنی کوفتوں سے گزرتا ہے تو وہیں وہ جسمانی طور پر بھی خاصی تھکان محسوس کرتا ہے لیکن جب کسی شخص میں ادبی ذوق وشوق اور محنت ولگن کا جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو پھر کسی بھی تھکان اور کٹھنائی کا احساس نہیں رہتا بلکہ ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ بقول غالؔب:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خان کچھ اسی نوعیت کے قلم کار ہیں۔ حال ہی میں اُنھوں نے ''ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی (حیات اور کارنامے)'' عنوان سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دی ہے جو اپنے مواد اور ظاہری آراستگی کے لحاظ سے نہایت پُرکشش اور دیدہ زیب ہے۔

یہ بات مُسلّمہ ہے کہ دہلی، لکھنو اور عظیم آباد کی طرح رام پور بھی دبستان رہا ہے۔ اس سرزمین سے بڑے بڑے عالم وفاضل، باکمال اُدبا وشعرا اور فن کار پیدا ہوئے ہیں کہ جنھوں نے اپنے اپنے میدان میں حیرت انگیز کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی محنت ولگن، ذوق وشوق اور بہتر تعلیم وتربیت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی ضلع غازی پور (یوپی) کی ایک مایہ ناز علمی وادبی شخصیت تھے کہ جنھیں ہمہ جہت ادبی شخصیت کہنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف ایک شاعر، محقق ونقاد اور مُبصر ومفکر تھے بلکہ ایک بہتر منتظم بھی تھے۔ وہ ہندی، اُردو، انگریزی،

فارسی، مراٹھی اور گجراتی بھی جانتے تھے۔ ڈاکٹر وقار اُلحسن صدیقی 1993ء سے 2009ء تک ہندوستان کی مشہور و معروف لائبریری رضا لائبریری رام پور میں بحیثیت او۔ ایس۔ ڈی تعینات رہے کہ جہاں اُنھوں نے اپنی خوش اُسلوبی اور بہترین منتظمانہ صلاحیتوں کے تحت مذکورہ لائبریری کو عالمی معیار کا بنانے اور اس کی شہرت کو برقرار رکھنے میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ وقار اُلحسن صدیقی 11 ستمبر 1934ء کو پیدا ہوئے تھے اور 18 جون 2009ء کو اس جہان فانی سے چل بسے۔ گویا وہ کُل پچھتر برس دُنیا میں زندہ رہے۔ اُن کی حیات و شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو جن میں اُن کی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی خدمات کے علاوہ اُن کے اخلاق و عادات اور طرز فکر کو خصوصی دخل حاصل ہے۔ بلاشُبہ ڈاکٹر وقار اُلحسن صدیقی ایک جامع، پُر وقار اور مرنجان مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ اُن پر جن اُدبا و شعراء نے مضامین لکھے ہیں اُنھیں ڈاکٹر اطہر مسعود خان نے جس عمدہ ترتیب و تہذیب سے کتابی صورت میں شائع کروایا ہے، وہ اُردو قارئین کے لیے دلچسپی، آگہی، لفظ و معنی کی نزاکت، زبان و بیان کی شیرینی کے علاوہ شخصیت نگاری کے فن سے بھی آشنا کراتی ہے۔ 680 صفحات پہ مشتمل یہ کتاب جس کے خوب صورت ٹائٹل کوَر پہ موٹے حروف میں ''ڈاکٹر وقار اُلحسن صدیقی (حیات اور کارنامے)'' لکھا ہوا ہے پہلی ہی نظر میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنو کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ محمد اطہر مسعود خان نے اس کتاب کو اپنے والد محترم جناب محمد غوث خان کے نام منسوب کیا ہے۔ فہرست مضامین کے ابتدائی حصّے میں اُتر پردیش اُردو اکادمی کی چیرمین محترمہ ترنم عقیل اور ماہنامہ ''نیا دور'' کے ایڈیٹر محترم ڈاکٹر وضاحت حُسین رضوی کے پیغامات شامل کیے گئے ہیں جب کہ کتاب کے مرتّب جناب اطہر مسعود خان نے وقار اُلحسن صدیقی کا مختصر سوانحی تعارف اور پیشِ لفظ لکھ کر قاری کو یہ باور کرایا ہے کہ زیرِ نظر کتاب جس اہم شخصیت کی حیات و خدمات کا احاطہ کرتی ہے وہ اپنے افکار اور تعمیری کردار سے لائق تحسین ہے۔ مذکورہ کتاب میں کُل 49 مضامین شامل کیے گئے ہیں جب کہ حصۂ منظومات میں کُل اٹھارہ شعرائے کرام نے مرحوم ڈاکٹر وقار اُلحسن صدیقی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ متفرقات کے تحت اطہر مسعود خان نے وقار اُلحسن صدیقی کے مجموعۂ کلام

''عکس ہستی'' کا اشاریہ، انتخاب کلام عکس ہستی، مطبوعات رام پور رضا لائبریری، رام پور رضا لائبریری مشاہیر کی نظر میں، ان عنوانات کے تحت وقار اُلحسن صدیقی کی علمی، ادبی اور ایک وسیع الذّہن اور وسیع النظر آفیسر کی حیثیت سے خدمات کا تفصیلی مگر غیر جانبدارانہ طور پر ذکر کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں جتنے بھی مضامین شامل کیے گئے ہیں سب وقار اُلحسن صدیقی کی شاعرانہ عظمت، جذبہ انسان دوستی، اُن کے اخلاق وکردار، خلوص، ہمدردی اور مہمان نوازی کے علاوہ اُن کے تعمیری افکار ونظریات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ان ڈھیر سارے مضامین کو پڑھنے کے بعد جہاں وقار اُلحسن صدیقی جیسی فعال اور پُر وقار شخصیت کے تمام پہلوؤں سے مکمل واقفیت حاصل ہوتی ہے تو وہیں کتاب کے مُرتب کی مولّفانہ صلاحیتوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ اُنھوں نے اُردو کے اہم اُدبا وشعرا سے مضامین لکھوا کر اتنی عمدہ، ضخیم اور بصیرت افروز کتاب مُرتب کر کے مرحوم وقار اُلحسن صدیقی کو عملی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کسی اہم ادبی شخصیت سے متعلق مضامین لکھوا کر اُنھیں اس طرح ترتیب دینا کہ متعلقہ شخصیت کی زندگی کے تمام گوشے قارئین کے سامنے آجائیں نہایت مشکل، صبر آزما، دقّت طلب اور ذمہ دارانہ فعل ہے۔ اس کے لیے ہمت وحوصلہ، ذوق وشوق اور خود اعتمادی کا جذبہ درکار ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے مذکورہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر اطہر مسعود خان میں متذکرہ جملہ جذبات موجود ہیں۔ پوری کتاب میں شامل تمام مضامین قاری کو زبان وبیان کی لُطف اندوزی، شیرینی اور وافر معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ بات بھی مسرت کُن ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں کتابت کی غلطیاں دیکھنے میں نہیں آرہی ہیں۔ اتنی معلوماتی، ضخیم، صوری ومعنوی خوبیوں سے مزّین کتاب ''وقار اُلحسن صدیقی (حیات اور کارنامے) کی کُل قیمت 600روپے ہے جو اس گراں بازاری کے دور میں بالکل مناسب ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ڈاکٹر اطہر مسعود خان کو اتنی خوب صورت کتاب مرتب کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ وقار اُلحسن صدیقی کو راہیِ ملکِ عدم ہوئے تقریباً دس سال ہو چکے ہیں، میں یہ جانتے ہوئے مایوس ہو رہا ہوں! خواجہ حیدر علی آتش نے دُرست فرمایا ہے:

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

چراغ دل کا جلاؤ بہت اندھیرا ہے

خالق کائنات نے اس کائنات کو ایک منظّم صورت میں پیدا فرمایا ہے۔ موسموں کا تغیر وتبدل، گردش روز وشب، پیدائش وموت، مظاہر فطرت میں ایک خاص طرح کا توازن غرضیکہ پورے نظام عالم پہ نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی شے بے کار وبے فائدہ پیدا نہیں فرمائی ہے۔ ہر انسان پر بالغ ہونے کے بعد یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق ان تین بنیادی اور اہم سوالوں کے جوابات کی تلاش و تجسّس میں لگ جائے۔ پہلا سوال یہ کہ میں اس دُنیا میں کہاں سے آیا ہوں؟ یا یہ کہ میرا اصلی خالق ومالک کون ہے؟ دوسرا سوال یہ کہ مجھے اس دُنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے؟ تیسرا سوال یہ کہ مجھے مرنے کے بعد کہاں جانا ہے؟ ان تینوں سوالات کے جوابات کی تفہیم کے لیے اللہ رب العالمین نے ابتدائے آفرینش سے یعنی حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد صحابہ، تابعین، تبا تابعین، اولیائے کرام اور بزرگان دین نے بھی اپنے اپنے طور پر انسانی سماج ومعاشرے میں ان بنیادی تین سوالوں کے تناظر میں عالم ارواح، مقصد حیات وکائنات اور عالم برزخ کی زندگی کے بارے میں علم وآگہی کا عظیم فریضہ دعوت وتبلیغ کی صورت میں انجام دیا ہے۔ سماجیات کے ماہرین نے انسان کو سماجی جانور تصور کیا ہے جو ایک حد تک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح اپنی فطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے لیکن اسے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ تمام مخلوقات میں انسان کو اللہ

تعالیٰ نے جو فوقیت اور گوناں گوں نعمتیں عطا فرمائی ہیں اُن سے حیوانات محروم ہیں۔ مثلاً انسان کو اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی، صلاحیت تحریر وتقریر، تہذیب وشائستگی، غور وتدبر، فہم وفراست، مختلف علوم وفنون کو حاصل کرنے کا جذبہ، ادب وثقافت کے ساتھ قدرت کے سربستہ رازوں کو جاننے سمجھنے کا شعور بخشا ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کی صبح تک دنیا میں بسنے والے انسانوں کی دُنیاوی واخروی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے پیارے اور لاڈلے محبوب حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر قرآن حکیم جیسی عظیم ولامثال کتاب کا نزول فرمایا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے احکامات، اُس کے فرماں بردار بندوں کے انعامات اور فتح ونصرت کے علاوہ اللہ کے نافرمانوں اور باغیوں کے عبرتناک انجام کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں موجود ہے۔ وہ شخص خوش نصیب ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور نُورانی طریقوں کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق حاصل ہوجائے۔

یہ کائنات ایک خودکار مشین کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک عظیم حکمت وقدرت رکھنے والی طاقت ہے جو اس کائنات کے نظام کو چلا رہی ہے۔ گویا انسان اس خدائی نظام اور ضابطوں کے آگے بے بس ومجبور بھی ہے اور کسی حد تک خودمختار بھی۔ بے بس ان معنوں میں کہ وہ خدائی فیصلوں کو بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ مثلاً آسمان سے بارش برستی ہے آدمی اُسے روک نہیں سکتا، آدمی ہمیشہ جوان رہنا چاہتا ہے لیکن خدائی ضابطے کے مطابق وہ بوڑھا ہوجاتا ہے۔ آدمی کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے موت نہ آئے لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ غرضیکہ آدمی قانون فطرت کے آگے بے بس ومجبور ہے یا یوں کہیے کہ وہ لاکھ کوششوں کے باوجود خدائی ضابطوں کو نہیں بدل سکتا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اس دُنیا میں کس حد تک خودمختار ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ انسان اعمال کے اعتبار سے وقتی طور پر اس دُنیا میں آزاد ہے۔ وہ چاہے تو اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاکیزہ اور نورانی طریقوں کے ساتھ گزار سکتا ہے اور نہ چاہے تو اللہ کا باغی، سرکش اور نافرمان بن کر بھی زندگی گزار سکتا

ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے قانون، ضابطے اور نصاب کے مطابق زندگی بسر کرنیکی تلقین کرتا ہے۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انسان کو ایک بہتر اور کامیاب زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں۔ سچ اور جھوٹ، اچھا اور بُرا، حق و باطل، کفر وشرک، نیک و بد، ظالم ومظلوم، حرام وحلال، جائز وناجائز اور خیر وشر، یہ تمام مثبت ومنفی اور متضاد باتیں یا حسنات وخرافات کے مضر ومفید اثرات کو قرآن وحدیث میں بڑے واضح، مدلّل اور بہت حد تک سائنٹیفک انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا معلوم یہ ہوا کہ آدمیت سے انسانیت تک کے سفر میں ہر شخص پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اُن تمام شرور اور خبائث سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے کہ جن سے بچنے کی تاکید وتلقین قرآن وحدیث میں آئی ہے۔

زندگی ایک غیر یقینی سفر ہے اور ہم سب وقت کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں وقت کی قسم کھائی ہے کہ بے شک انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وقت ہی کی قسم کیوں کھائی؟ کسی اور مخلوق کی قسم کیوں نہیں کھائی؟ معقول جواب یہ ہے کہ دراصل یہ وقت ہی ہے کہ جو پورے نظام عالم پر حاوی ہے۔ ہر چیز وقت کی گردش میں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ موسم بدلتے ہیں حیوانات، نباتات وجمادات میں تغیر وقت کے ساتھ آتا ہے۔ انسان، بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں طے کرتا ہے اور آخر کار اُس کا فانی وجود وقت کے ساتھ ساتھ فنا ہوجاتا ہے۔ منشی امیر اللہ تسلیم کا یہ شعر صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

وقت کی قدر کرنے والا کامیاب ہے اور وقت کو ضائع کرنے والا سوائے پچھتاوے کے کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا فرمایا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا ہے کہ میرا پیدا کردہ یہ حضرت انسان میرے احکامات کے خلاف دُنیا میں زندگی بسر کرے۔ مشہور مقولہ ہے کہ وقت کی نماز بے

وقت کی ٹکریں۔ گویا وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ وقت پہ لیا صحیح فیصلہ چاہے وہ کسی بھی معاملے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو صدیوں پہ بھاری پڑ جاتا ہے۔ تمام مذاہب، فکر و فلسفے، علوم وفنون اور علمی، ادبی، سائنسی اور روحانی دانش گاہیں آدمی کو ایک بہترین انسان بننے کی تربیت دیتی آئی ہیں لیکن شیطان، بُری خواہشیں اور بُرا ماحول آدمی کو ایک اچھا انسان بننے نہیں دیتا۔ دنیا کو امتحان گاہ بھی کہا جاتا رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اچھے اور بُرے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ بہر حال ہر آدمی نے مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے اچھے بُرے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ طے شُدہ بات ہے کہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ تمام رشتے ناطے، مال ودولت، عہدے، جاہ وحشمت غرضیکہ سب ٹھاٹھ یہیں پڑا رہ جاتا ہے اور جانے والا تن تنہا ایک ایسی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے کہ جہاں سے پھر وہ واپس اس دُنیا میں نہیں آتا ہے۔

ایمان اور دینی تعلیم سے روگردانی کے نتیجے میں آج کثیر تعداد میں دُنیا کے لوگ انتشار، بے امنی، بددیانتی، بے حیائی، بے اعتمادی، منافقت، عیاری، مکاری اور غداری کے ساتھ لرزہ خیز گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔ سائنسی انکشافات کے سبب کئی حیرت انگیز ایجادات آئے دن سامنے آرہی ہیں۔ آج کا انسان گوشۂ تنہائی میں تنہا رہنے کے باوجود تنہا نہیں ہے۔ مانا کہ سوشل میڈیا کی یلغار نے بہت سی انسانی مشکلات کو حل کردیا ہے۔ انٹرنیٹ کی دُنیا کا آج کا یہ انسان اپنے آپ میں ایک انٹرنیٹ بن چکا ہے لیکن اس سب کے باوجود مرنے جینے، خوشی وغمی اور طرز بُو دوباش کے طور طریقے بدل چکے ہیں۔ نمود ونمائش، خودغرضی، خود پسندی وخود پرستی نے انسانی اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال نے تقریباً ہر طبقے اور عمر کے لوگوں کے دلوں سے شرم وحیا، احساس ذمہ داری، خوف آخرت اور رشتوں کا تقدّس ختم کردیا ہے۔ مادیت، روحانیت پر غالب آگئی ہے۔ فسق وفجور میں لوگ لذت محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہر شخص بغیر محنت، ایمانداری اور دیانتداری کے شہرت اور عزت حاصل کرنے کے چکّر میں ہے۔ ہزاروں

خواہشیں جن میں جائز کم اور ناجائز زیادہ ہوتی ہیں کو لے کر لوگ سینکڑوں برس تک جینا چاہتے ہیں۔ یہ احساس نہیں رکھتے کہ کسی بھی وقت جسم وجاں کا تعلق منقطع ہوسکتا ہے۔ نئی نسل آدھی آدھی رات تک موبائل فون پہ حیاسوز ویڈیوز دیکھنے کی عادی ہوچکی ہے۔ والدین اپنی اولاد سے اس لیے نالاں ہیں کہ وہ اُن کا نہ تو کہنا مانتی ہے اور نہ ہی اُن کا ادب واحترام کرتی ہے۔ آج کے بچّے بالغ ہونے سے پہلے ہی بالغ ہورہے ہیں۔ آج بھی فرقہ پرستی، ذات پات، رنگ ونسل، علاقائیت، تعصب، مذہب اور دھرم کی بنیاد پہ لڑائی جھگڑے، فتنہ وفساد اور کئی دل دہلا دینے والے حالات وواقعات آئے دن سامنے آتے ہیں۔ حالانکہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا لیکن اس کے باوجود سماج وسوسائٹی میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کی ممانعت مذاہب میں بھی آئی ہے اور قانون میں بھی۔ زیادہ تر لوگ اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں کوتاہی برتتے ہیں اور اپنے حقوق کا راگ زیادہ الاپتے ہیں۔ ہر روز بھیانک جرائم اخبارات کی سُرخیاں بنتے ہیں۔ منشیات میں لوگ اپنی جانیں گنوار ہے ہیں۔ بہت سے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں طلبہ وطالبات عقل کے بجائے نقل سے کام چلا لیتے ہیں۔ اب وہ نصاب کی کتابیں نہیں پڑھتے بلکہ نوٹس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نقل کی وبا نے ہمارے تعلیمی معیار کو پست کردیا ہے۔ علم وادب کہ جس کا بنیادی مقصد انسان کو جہالت اور لاعلمی کے اندھیروں سے نکال کر فہم وفراست، تہذیب وشائستگی اور شعور وبصیرت کی روشنی میں لانا ہے، عملی صورت میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا ہے بلکہ ایک پڑھا لکھا بے عمل سماج عالم انسانیت کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ بہتر تعلیمی نظام کے فُقدان میں اساتذہ اور طلبہ برابر کے شریک ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں جب تک احساس ذمہ داری اور مخلصانہ جذبہ کارفرما نہیں ہوگا تب تک کوئی بھی بہتر عملی صورت نظر نہیں آسکتی۔

اُوپر بیان کی گئی اُن تمام سماجی برائیوں، ذہنی خباثتوں اور بالخصوص آج کل کے سوشل میڈیائی دور کے انسان کی بے فکری، کسل مندی، بے راہ روی اور بے عملی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پوری دُنیا کے لوگوں کو اپنا وقت ضائع کیے بغیر قرآن وحدیث کی پاکیزہ اور نُورانی تعلیمات سے مستفید ہونے کے لیے پہل کرنی

چاہیے۔ایک باشعوراور سنجیدہ شخص کی سوچ کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ وہ دوراندیش ہونے کے ساتھ ساتھ عاقبت اندیش بھی ہوتا ہے۔ وہ سُود وزیاں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دنیا اور آخرت میں ایک خوب صورت اور کامیاب زندگی بسر کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ انسان کے تمام اعمال کا دارومدار اُس کی نیت پر ہے۔ نیت اچھی ہوگی تو اعمال بھی اچھے سرزد ہوں گے اور نیت بُری ہونے کی صورت میں اچھے اعمال کے سرزد ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص (بلالحاظ مذہب وملّت) کو چاہیے کہ وہ نیکیوں کے کاروبار میں لگ جائے۔ اپنی نیت کو ہروقت ٹٹولتا رہے کہ اُس کی نیت میں کوئی کھوٹ تو نہیں آگیا کیونکہ نیت کا بگاڑ انسان کو بُرائی کے اڈوں پر لے جاتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ بُرے کاموں کے اثرات نہ صرف ایک شخص کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ اجتماعی زندگی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس لیے آیئے قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم سب اپنی اپنی زندگیوں کا سفر طے کریں تاکہ ہماری دُنیا بھی سنور جائے اور آخرت میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امن وسکون کی زندگی جینے کے لائق بن سکیں۔ ورنہ بقول علامہ اقبالؔ

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

....

تمام شُد